حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۲۴

غلام سرور

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

پروفیسر احسان اشرف

Monograph-24

Ghulam Sarwar

By : *Prof. Ehsan Ashraf*

''غلام سرور کی شخصیت، چٹانی عزم، آہنی ارادے اور ایک نہ تھمنے والے طوفان سے تعبیر ہے۔
ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ''نوجوان'' سے ہوا۔ اس کے بعد ''ساتھی'' اور پھر ''سنگم'' کا اجراء کیا۔
''سنگم'' اپنے اولین شمارہ سے ہی حق کا ترجمان، مظلوموں کا نقیب، اور فرقہ پرستی کے خلاف ایک با اثر آواز بن گیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اردو تحریک، مدرسہ تحریک، بہاری بچاؤ تحریک، فلسطین بچاؤ تحریک، اصلاح وقف بورڈ تحریک چھیڑی۔ سبھی تحریکات کے بانی وہ خود تھے۔ اور ان سبھوں کے اطمینان بخش اور سودمند نتائج بھی سامنے آئے۔ زندگی کے متعلق غلام سرور کا ایک مخصوص نقطہ نظر ہے۔ انہوں نے نظریہ اسلام، نظریہ تعلیم، نظریہ زبان وادب، نظریہ سیاست ،نظریہ صحافت، نظریہ وطنیت، نظریہ ملی قیادت، نظریہ حسب ونسب وغیرہ کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا اظہار بھی کیا۔ ان کے نظریہ میں توازن، وسعت نظر اور فکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بہت بڑا حلقہ ان کے نظریات و تحریکات کے زیر اثر آ گیا۔ بالخصوص آزادئ ہند کے بعد ان کی صحافت اور سیاست نے ایک قابل ذکر اور اہم رول ادا کیا۔ اور خود وقت کی ابھرتی ہوئی نئی نسلوں پر ایک اثر ڈالا۔ ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے نوجوانوں کے اندر ناموافق حالات سے لڑنے کے لیے حوصلہ پیدا ہوا۔''

ان کے یہ جملے بھی ملاحظہ کریں:۔

''بہار کی دو عظیم الشان تحریک اردو جن کے سبب بالآخر اردو آئینی وقانونی طور پر ریاست کی دوسری سرکاری زبان بن گئی، اس کو ابھارنے اور آگے بڑھانے میں ایک مدت تک غلام سرور نے کلیدی اور تاریخی رول ادا کیا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ ایک مثالی واقعہ ہے جو پورے ہندوستان کی اردو دنیا کے لئے ''مشعل راہ بن گیا ہے۔''
(حوالہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی، ہمدم دیرینہ خصوصی شمارہ سنگم ۱۹۹۴ء)

اس فردنامہ کے مصنف احسان اشرف، صدر شعبہ فلسفہ کی حیثیت سے کالج آف کامرس، پٹنہ میں خدمت انجام دے چکے ہیں۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو تحریک سے منسلک رہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا پہلا انشائیہ ''دامن کوذرا دیکھ'' 1973ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے 1976ء میں انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں ''اردو کی کہانی تصویروں کی زبانی'' کے عنوان پر ایک شاندار اردو نمائش کا انعقاد کیا۔ 1983ء میں ایوان غالب نئی دہلی کے عظیم الشان اور تاریخی ڈرامہ ''اردو کی کہانی'' روشنی اور آواز کی زبانی (داستان میری) کا یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ کے بعد پٹنہ کے معین الحق اسٹیڈیم میں شاندار انعقاد کرایا، جسے روزانہ تین دنوں تک تقریباً 25 ہزار لوگوں نے دیکھا۔ اردو میں ان کی ''لسانی فلسفہ''، ''وجودیت کا فلسفہ''، ''وجودی مفکرین'' اور انگریزی زبان میں غزالی، اقبال اور ابن رشد کا فلسفہ پر ان کی کتابیں شائع ہو کر قارئین کو مستفید کر رہی ہیں۔ فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی شناخت پورے ہندوستان میں کل ہند کانفرنس کے ذریعہ قائم کیا۔ وہ جموں وکشمیر کی سالانہ کانفرنس فلسفہ، یونیورسٹی آف کیرالہ اور یونیورسٹی آف پانڈیچیری میں فلسفہ پر اپنا وقیع اور معلومات افزا مقالہ پیش کر چکے ہیں۔

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

غلام سرور

احوال زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ

پروفیسر احسان اشرف

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۲۴

Ghulam Sarwar

By
Prof. Ehsan Ashraf

نام کتاب	:	غلام سرور
مصنف	:	پروفیسر احسان اشرف
سال اشاعت	:	2023ء
کل صفحات	:	123
کمپوزنگ وتزئین	:	محمد سعید احمد
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ:
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر: 0612-2530093، ای میل: directorurdu@gmail.com

فہرست

- پیش لفظ — احمد محمود — 5
- ابتدائیہ — پروفیسر احسان اشرف — 9
- غلام سرور: ایک نظر — 12
- غلام سرور کی ادبی زندگی — 15
- ٹھیک پچاس سال پہلے — 22
- اور اب پچاس سال بعد — 24
- غلام سرور کی صحافتی زندگی — 27
- سنگم کا پہلا اداریہ — 31
- غلام سرور کی سیاسی زندگی۔ عملی سیاست میں حصہ داری — 74
- غلام سرور کی سیاسی زندگی کا آغاز — 75

- سفرنامہ حج ”دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا“ — 82
- منتخب تحریریں (۱): یہ قصہ ہے جب کا............ — 84
- منتخب تحریریں (۲): مواد اور ہیئت — 98
- آیت الکرسی: تفسیر و تفہیم — 107
- غیر ملکی سفر کی ایک مختصر روداد — 115
- کہتی ہے تجھ کو خلق خدا............ — 119
- تصانیف غلام سرور............ — 121
- کتابیات — 122
- خراج عقیدت............ابونصر فاروق صارمؔ — 123

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنا اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں تئیس (۲۳) مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفرپوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ، ۱۱۔ غیاث احمد گدی، ۱۲۔ جمیل مظہری، ۱۳۔ انجم مانپوری، ۱۴۔ بیتاب صدیقی، ۱۵۔ عبدالغفور شہباز، ۱۶۔ فضل حق آزاد، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ کلام حیدری، ۱۹۔ اویس احمد دوراں، ۲۰۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۱۔ امداد امام اثرؔ، ۲۲۔ احمد یوسف، ۲۳۔ صدیق مجیبی کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا۔

کورونا کی وبا سے جب راحت ہوئی تو ''اراکین ادب بہار'' جو بہار کے پچیس بزرگ ادباء کی نگارشات پر مشتمل ہے، مارچ ۲۰۲۰ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اردو ڈائرکٹوریٹ نے ۲۳رفروری ۲۰۲۱ء میں ان شعراء و ادباء کے اعزاز میں ایک شاندار جلسہ منعقد کیا اور اراکین ادب بہار کا رسم اجراء ہوا۔ اس میں جناب امتیاز احمد کریمی و دیگر اہم ادبی شخصیات بھی شریک ہوئیں۔

غلام سرور اردو تحریک اور اردو زبان و ادب کی ایک مستند اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ وہ اردو کے عظیم صحافی، معتبر ادیب، ماہر سیاست داں، بڑے تحریک کار اور اردو کے علمبردار تھے۔ انہوں نے بہار میں اردو کے لئے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلسل تحریک چلائی اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلایا۔ اردو صحافت اور اردو زبان کو غلامی کی زنجیروں سے نکال کر اس کے وجود کا احساس کرایا۔ مرحوم غلام سرور اردو تحریک کے روحِ رواں اور سالارِ اردو تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ اردو زبان اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایک مثال اور علامت تھے۔

اس فرد نامہ کے مصنف پروفیسر احسان اشرف، وہ فلسفہ کے بڑے مقتدر استاد (یونیورسٹی پروفیسر و صدر شعبہ فلسفہ کالج آف کامرس، پٹنہ) رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اقبال کے فلسفہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ احسان اشرف نے پہلا انشائیہ ''دامن کو ذرا دیکھ'' ۱۹۷۳ء میں شائع کرایا۔ اس انشائیہ پر پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر عبدالمغنی کا حیرت انگیز تبصرہ و تنقید ان کی کتاب ''لسانی فلسفہ'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کافی حد تک اپنی دو کتابیں ''وجودیت کا فلسفہ'' اور ''وجودی مفکرین'' میں اردو زبان و ادب پر تفصیل کے ساتھ تعارف پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتہائی مختصر الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انسانی شعور کی محرومیوں کو کیرکیگارڈ نے ایک لافہم خدا میں، یاسپرس کی ماورائیت میں، مارشل کی پُراسراریت میں، نطشے کی فوق البشری میں، ہائی ڈیگر کی موت میں، سارتر کی نیستی میں اور آلبر کامو کی بغاوت میں جاگزیں کیا گیا ہے۔

احسان اشرف ادب اور فلسفہ کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے ہیں۔ وہ اردو تحریک سے

ایام طالب علمی سے ہی نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔۔۔‘‘ کے جذبہ سے اردو زبان وادب کی خاموشی سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔انہوں نے ۱۹۷۶ء میں انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ’’اردو کی کہانی تصویروں کی زبانی‘‘ کے عنوان سے ایک شاندار اردو نمائش کا انعقاد کیا تھا اور ۱۹۸۳ء میں ایوانِ غالب، نئی دہلی کے عظیم الشان اور تاریخی ڈرامہ ’’اردو کی کہانی روشنی اور آواز کی زبانی‘‘ (داستان میری) کا یوپی اردو اکادمی، لکھنو کے بعد پٹنہ کے معین الحق اسٹیڈیم میں شاندار انعقاد کرایا۔ جسے روزانہ تین دنوں تک تقریباً پچیس ہزار لوگوں نے دیکھا۔۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء تک بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا دفتر ان کے کرایہ کے گھر بیت الوارث میں قائم رہا۔

غالباً ۱۹۷۷ کے بعد ہی ’’اردو یونیورسٹی (جامعہ اردو) کے قیام کی تجویز اور ایک انوکھی ’’اربورک‘‘ نمائش انجمن اسلامیہ ہال میں منعقد کرائی۔

میری معلومات کے مطابق جناب احسان اشرف نے کلیم عاجزؔ کی نثری تصنیف ’’ابھی سن لو مجھ سے‘‘ اور ایک یادگار مجلّہ کا رسم اجراء کی شاندار تقریب جناب غلام سرور، اسپیکر، بہار قانون ساز اسمبلی اور فکشن کے مجلس استقبالیہ کی صدارت میں ۱۹۹۵ء میں بھارتیہ نرت کلا میں انجام دی تھی۔

اردو میں اُن کی تین کتابوں (وجودیت کا فلسفہ، وجودی مفکرین، لسانی فلسفہ) کے علاوہ انگریزی میں ان کی تین کتابیں غزالی، ابن رشد اور اقبال کے فلسفہ پر شائع ہو چکی ہیں۔

اردو میں پہلی بار وٹگنسٹائن کا لسانی فلسفہ اور تجزیہ، سوسئیر کی ساختیات اور ژاک دریدا کا نظریہ ردِ تشکیل کچھ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جس نے مغرب میں فلسفہ کا رخ پھیر دیا۔

اس فردنامہ میں شری چندر نرائن ملا اور شری کشن پرساد کول کے اظہار خیال اور سنگم کے دفتر میں شری کیدار پانڈے (سابق وزیراعلیٰ، بہار) کی آمد پر ان کی گذارش اور ان کی غلام سرور کے متعلق دریافت کے حوالے سے بڑی دلچسپ اور قابل توجہ باتیں درج ہیں۔

۲۰۰۵ء میں ان کے رجسٹرڈ ادارہ (۱۹۷۶ء) کے زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز ہال میں ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے ’’اردو منشور کانفرنس‘‘ کا افتتاح کیا۔

فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی شناخت پورے ہندستان میں کل ہند فلسفہ کانفرنس کے ذریعہ بنائی۔(کشمیر کی جموں وکشمیر سالانہ کانفرنس فلسفہ میں ’’وجودی نقطہ نظر‘‘ کے عنوان سے

مقالہ پیش کیا۔ یونیورسٹی آف کیرالہ میں یکے از صدر Ethics & Social Philosophy اپنا صدارتی خطبہ اخلاقی اضافیت (Relativity Ethical) پیش کیا اور ایک منتخب سمپوزیاسٹ (Symposiast) کی حیثیت سے یونیورسٹی آف پانڈیچری میں مشہور مفکر اروند کے آشرم میں اپنا مقالہ ’’انسانی اتحاد کا آئیڈیل‘‘ اروند کے حوالے سے اور دیگر نظریہ خدا کی وحدانیت سے انسانی اتحاد۔۔۔‘‘ پیش کیا۔

غلام سرور سے ان کی ملاقاتوں کا دراز سلسلہ اور ان سے وابستہ یادیں رہی ہیں۔اس اعتبار سے ان کا لکھا ہوا یہ فردنامہ غلام سرور کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

نئے سال ۲۰۲۳ء میں خدا کرے یہ فردنامہ اور پہلے کے دیگر فردنامے اردو زبان وادب کی بقا اور ترقی میں معاون اور ’’سب کے لئے‘‘ مبارک ہو۔

ہمیں توقع ہے کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش آپ قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

۱۲/اگست ۲۰۲۱ کو اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار کے ڈائرکٹر جناب احمد محمود کا ایک نوازش نامہ موصول ہوا جس میں مجھ سے غلام سرور مرحوم کا فرد نامہ لکھ دینے کی گزارش کی گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ مجھ جیسے کم علم شخص سے غلام سرور جیسی عبقری شخصیت پر فرد نامہ لکھنے کا انتخاب کس طرح ہو گیا، جب کہ شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں ایک سے ایک لکھنے والے قلم کار موجود ہیں۔

بہرحال یہ بات صحیح ہے کہ ایام طالب علمی سے یعنی جب میں ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری میں مصروف تھا، میری ملاقات غلام سرور مرحوم سے انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں اوپر ایک چھوٹے کمرے میں ایک مختصر وقت کے لئے ہوئی تھی۔ اس وقت بہار میں دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو علاقائی زبان بنانے کے لئے دستخطی مہم کا ایک نشانہ بنا کر بیحد مصروف تھے۔ پھر اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ان سے وابستہ یادیں بھی۔ سنگم میں میرے کئی انشائیے بھی شائع ہوتے رہے۔ کچھ عرصہ تک سیاسی ڈائری، چیخوف کا افسانہ The Bet (اردو ترجمہ) بازی کس نے جیتی، سیاسی نظریات کا ارتقا، ایک مختصر تاریخ شائع ہوئے۔ افسوس کہ ان کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں۔

غلام سرور مرحوم کا فرد نامہ لکھنا میرے لئے ایک سعادت ہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۵ء وہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو (دہلی کی انجمن کی شاخ سے ملحق) کی قیادت کرتے رہے۔ وہ جنرل سکریٹری، صدر یا رکن جو بھی رہے ہوں۔ غلام سرور مرحوم اور مولانا بیتاب صدیقی کے بعد ۱۹۷۳ء میں نے اپنے تیسرے کتابچے۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کارگزاریاں لکھ دی ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہے، اس لئے یہ فرد نامہ میں شامل کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ صرف اتنا عرض ہے کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو میں اردو کی واحد ترین تحریک تھی اور غلام سرور سالار اردو تسلیم کئے جاتے تھے اور ان کے انتہائی قریبی ہم نشینوں میں سید شاہ مشتاق احمد، پروفیسر عبدالمغنی اور مولانا بیتاب صدیقی تھے۔ اردو کی یہ تحریک صرف بہار میں ہی نہیں بلکہ

پورے ملک ہندوستان کے لئے اردو کا پیغام محبت تھی۔

اس فرد نامے میں میں نے غلام سرور کے تین پہلوؤں پر خاص طور سے ان کی ادبی زندگی، صحافتی زندگی اور سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سفر نامہ حج اور دنیا بھر کے کئی غیر ملکی سفر ناموں کی ایک مختصر تفصیل بھی شامل کی ہے۔ پورے بہار سے غلام سرور مرحوم کو وزیر اور اسپیکر حکومت بہار کے جو سپاس نامے پیش کئے گئے ان کا مجموعہ 'کہتی ہے تجھ کو خلق خدا.....' کا ذکر بھی موجود ہے۔

غلام سرور کی ادبی زندگی ان کے ایام طالب علمی سے شروع ہو چکی تھی۔ اسے ان کی زندگی کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایم اے فرسٹ کلاس فرسٹ میں کامیاب ہونے تک ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''پرکھ'' ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ مگر ان کی ادبی زندگی کے درمیان ان کی صحافتی زندگی کا آغاز رسالہ 'نوجوان' ہفتہ وار سے جنوری ۱۹۴۸ء سے جاری ہو چکا تھا۔ مگر وہ اپنی صحافتی اور سیاسی زندگی کی خدمات اور مصروفیات سے منہ نہ موڑ سکے۔ اور دل میں اپنی خواہش کے مطابق چند دیگر کتابیں ''دنیا کا حال''، ''قرآن کا اسلام'' اور اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا موقع نہ نکال سکے۔

۲۰۰۴ء میں غلام سرور مرحوم اور ۲۰۰۶ء میں پروفیسر عبدالمغنی کے انتقال کے بعد اردو تحریک اور انجمن کی سرگرمیاں بھی تقریباً معطل ہو گئی تھیں۔ اس وقت حکومت بہار کے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر کے ڈائرکٹر جناب امتیاز احمد کریمی نے اردو کی ماحول سازی کے لئے کئی شاندار پروگرام کا انعقاد کرائے۔ اور ان کی سبک دوشی کے بعد جناب احمد محمود بہ حیثیت ڈائرکٹر بھی نہایت خوش اسلوبی اور اعتماد کے ساتھ اپنی کارکردگی انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے بہار کے وزیر اعلیٰ شری نتیش کمار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اب تک اردو کے تمام پروگراموں اور منصوبوں کی ہمت افزائی کی اور حکومت سے فنڈ کی کمی نہ ہونے دی۔

ڈاکٹر اسلم جاوداں، سابق نائب مدیر 'بھاشا سنگم' اور انچارج اردو پروگرام جنھوں نے اپنی سبک دوشی سے کچھ روز پہلے مجھے اردو ڈائرکٹوریٹ کے موجودہ ڈائرکٹر احمد محمود صاحب ہیں اس فرد نامہ سے متعلق ان کے فیصلے کی اطلاع پہنچا دی تھی۔ میں اعجاز حسن، ڈاکٹر نسیم اختر، مصنف، ناقد وصحافی ڈاکٹر اصغر جلال فریدی کے اخلاقی تعاون کے لئے بھی مشکور ہوں۔

میں خصوصی طور سے معروف سرجن ڈاکٹر اعجاز علی (سابق ایم. پی.) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے غلام سرور مرحوم کی کئی کتابیں، اور ان کی آخری کتاب آیۃ الکرسی تفسیر وتفہیم اور غلام سرور کے استقبالیہ سپاس ناموں کا مجموعہ بھی میری گزارش پر بھیج دیا، جس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ ابھی ان کے پاس ''سنگم'' کی کئی سالوں کی فائلیں بھی موجود ہیں جن کا مطالعہ کر کے غلام سرور مرحوم کے منتخب اداریوں کو بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ راقم الحروف اپنی کم علمی کے باوجود ایک عبقری شخصیت کے فرد نامہ کو تحریر کرنے پر کس حد تک کامیاب ہے، یہ تو قارئین اور اصحاب علم ہی بتا سکتے ہیں۔ ہمارے شکریہ کے مستحق خاص طور سے جناب ابونصر فاروق صارم صاحب بھی ہیں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس فرد نامہ کو نہایت دلچسپی سے کمپوز کیا اور اس تحریر سے متاثر ہو کر ایک تہنیتی نظم بھی لکھ ڈالی جو آخری صفحہ پر شامل ہے۔

احسان اشرف

غلام سرور: ایک نظر

نام : غلام سرور

تاریخ پیدائش : ۱۰/جنوری ۱۹۲۶ء

مقام پیدائش : بیگوسرائے

ولدیت : عبدالحمید (سینئر ڈپٹی کلکٹر)

ابتدائی تعلیم : حسب روایت گھر پر

چوتھے سے ساتویں تک بکسر ضلع انگلش اسکول

آٹھواں سے دسویں تک - مظفر پور ضلع انگلش اسکول

میٹرک - موتیہاری ضلع اسکول

اعلیٰ تعلیم : آئی ایس سی، سائنس کالج پٹنہ، ۱۹۴۳ء-۱۹۴۴ء

بی اے (انگریزی آنرس)، پٹنہ کالج ۱۹۴۴ء-۱۹۴۵ء

ایم اے (اردو)، پٹنہ یونیورسٹی، ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء

وکالت کی ڈگری، پٹنہ یونیورسٹی

شادی : محترمہ اصغر النساء، گوپال گنج ۴/اکتوبر ۱۹۵۰ء - تین بیٹیاں

خاندانی پس منظر : دادیہال، نانہال، سسرال...... باوقار

(۱) ادبی زندگی

ادبی زندگی میں چھ تنقیدی مضامین جو دیگر سرگرمیاں کا مجموعہ ''پرکھ'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔

تعارف اختر اورینوی۔ مقدمہ آل احمد سرور

: حج بیت اللہ کا شرف، سعادت حج، ۱۹۶۵ء

پہلے جنرل سکریٹری : بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا قیام ۱۹۵۱ء

قفس کی زندگی : ۱۹۶۴ء ۶۵ء، ۶۶ء، ۶۸ء، ۷۰ء، ۱۹۷۱ء

خدمات : تحفظ فلسطین کانفرنس ۱۹۵۱ء دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کی دستخطی مہم کا آغاز ۱۹۵۲ء-۱۹۵۳ء دس لاکھ اردو داں کے دستخط سے صدر جمہوریہ کو میمورنڈم ۱۹۵۶ء ریاستی انجمن ترقی اردو کا تاریخ ساز کنونشن زیر صدارت شری کشن پرشاد کنول ۱۹۶۵ء بہار میں اردو کو الیکشن ایشو بنانا ۱۹۶۷ء مردم شماری میں مادری زبان اردو کو درج کرانے کی مہم ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۱ء آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس پٹنہ میں ۱۹۷۲ء ہندوستان کے اردو صحافیوں کی طرف سے غلام سرور کی کلیدی نمائندہ کی حیثیت سے محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند سے رو برو گفتگو ۱۹۷۲ء بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے دفتر کی منتقلی بیت الوارث، نیا ٹولہ، پٹنہ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء پھر انجمن کی منتقلی نیا ٹولہ سے رمنہ روڈ نشیمن ۱۹۷۵ء مظفر پور میں انتخاب انجمن کا دو حصوں میں تقسیم ہونا ۱۹۷۵ء

(۲) صحافتی زندگی ـــ اور تحریک

: ایام کالج و یونیورسٹی سے ہی شروع

: آزادی کے فوراً بعد : ''سماج'' اور رسالہ ''نوجوان''

نوجوان کا نمبر ''ہم کیا کریں'' جنوری ۱۹۴۸ء

''ساتھی'' روزنامہ، سہیل عظیم آبادی سے منسلک ۱۹۴۹ء میں خریدا

''سنگم'' ہفتہ وار، دانا پور کینٹ (پٹنہ) ۱۰؍اکتوبر ۱۹۵۳ء

سنگم ہفتہ وار روزنامہ میں تبدیل پٹنہ سے ۱۰؍جنوری ۱۹۶۳ء

مقدمے اور اسیری : سنگم کے بعض اداریوں پر ۳۶ مقدمے حکومت کی جانب سے

(۳) سیاسی زندگی

عملی سیاست کا آغاز، سیوان حلقہ اسمبلی سے ایم.ایل.اے. منتخب ہو کر کرپوری ٹھاکر

کی وزارت اعلیٰ میں وزیر تعلیم (ثانوی) مقرر ہوئے ۱۹۷۷ء ۱۹۸۰ء سے کچھ پہلے غیر کانگریسی سرکار کے بعد کانگریس سرکار آ گئی اور دس سال بعد دربھنگہ کے کیوٹی اسمبلی حلقہ سے کامیاب ہوئے اور وزیر اعلیٰ لالو پرساد نے غلام سرور کو بہار قانون ساز اسمبلی کا اسپیکر بنا دیا۔ ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء۔ پھر دوسری بار بھی ۲۰۰۰ء میں کیوٹی حلقے سے کامیاب ہوئے۔

اسمبلی میں شعبہ اردو کا قیام، اردو عملوں کی تقرری، وقف بورڈ کی اصلاح اور رپورٹ، ہر مدرسہ میں حافظ قرآن کی تقرری وغیرہ۔ ۱۹۹۴ء دوسری بار دربھنگہ کے کیوٹی حلقہ سے کامیاب وزیر زراعت ۱۹۹۵ء تیسری مرتبہ بھی دربھنگہ کے کیوٹی حلقہ سے کامیاب وزیر زراعت ۲۰۰۰ء

۲۶ سالوں کے بعد بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا پرچم پروفیسر عبدالمغنی کو اردو تحریک کی مشعل حوالہ کرتے ہوئے ۲۰۰۱ء

غیر ملکی سفرنامے : اسپیکرشپ کے دوران غلام سرور کے غیر ملکی سفر ناموں کی ایک مختصر روداد اور ان کی دوٹوک بات۔

سپاس نامے : کہتی ہے تجھے خلق خدا........... سپاس ناموں کا مجموعہ جو انہیں والہانہ استقبال میں پیش کیے گئے۔

منتخب تحریریں : (۱) یہ قصہ ہے جب کا............ (۲) مواد اور ہیئت

غلام سرور کی آخری کتاب : آیت الکرسی کی تفسیر و تفہیم ۲۰۰۱ء

رحلت : ۱۷؍اکتوبر ۲۰۰۴ء...... بہ حیثیت وزیر زراعت، سرکاری اعزاز کے ساتھ۔ دانا پور میں دفن کئے گئے۔

غلام سرور کی ادبی زندگی

غلام سرور کی ادبی زندگی کا دور بھی پر کشش اور دلچسپ رہا ہے۔ان کے صحافتی زندگی کے آغاز سے پہلے دور کے زندگی کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ دوران کے ایام طالب علمی کی زندگی اور سرگرمیوں کو پیش کرتا ہے۔

غلام سرور کے احباب اور دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ان کی شخصیت ان سبھوں پر حاوی تھی۔ میٹرک کے وقت سے ہی وہ اردو کے مشہور شعراء اور ادباء سے بہت حد تک واقف ہو چکے تھے اور ان کی ''شاعری اور نظریات'' سے ان کے ذوقِ ادب کا ارتقاء ہو رہا تھا۔میٹرک کے اعلیٰ درجے میں کامیاب ہو کر اپنے والد کی مرضی کی وجہ سے سائنس کالج میں داخلہ لے چکے تھے۔آئی.ایس.سی.میں بھی اول درجے میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۴۴ء میں پٹنہ سائنس کالج سے پٹنہ کالج میں داخلہ لینے کو ترجیح دیا جہاں صرف آرٹس کی تعلیم ہوتی تھی۔بی.اے. میں داخلہ کے بعد انہوں نے انگریزی آنرس (English Honours) کا انتخاب کیا۔اب ان کو اردو ادب کی تاریخ کے علاوہ انگریزی ادب کی تاریخ اور اس کے مشہور شعراء ادباء، کے مطالعے کی تفصیلات بھی حاصل ہونے لگیں۔

اس زمانے میں بہار میں پٹنہ یونیورسٹی واحد یونیورسٹی تھی۔اور اس کے تینوں کالج یعنی بی.این.کالج (آرٹس وسائنس)، پٹنہ کالج اور سائنس کالج میں اردو کی بزم اور محفلیں بھی قائم تھیں۔اور کم از کم سال میں ایک بار ضرور ہی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔یہ سلسلہ ہم لوگوں کے زمانے میں ۱۹۶۰ء اور ایک دو سال تک جاری رہا۔اور پھر رفتہ رفتہ معدوم ہوتا ہوا ختم ہو چکا ہے۔

غلام سرور اپنے کالج کی سرگرمیوں میں پوری طرح سرگرم رہتے تھے۔ایام طالب علمی میں ہی ان کے کچھ مقالے مشہور اور معیاری رسالوں میں شائع ہوئے۔ان کا ایک مقالہ ان کے استاد ڈاکٹر اختر

اور ینوی کا ڈرامہ ''شہنشاہ حبشہ'' پر معیاری رسالہ ''معاصر'' میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ایک دوسرا مقالہ ''مواد اور ہیئت'' اردو ادب علی گڑھ میں اشاعت پذیر ہوا۔غلام سرور کا ایک ڈرامہ ''اقبال میدان حشر میں'' نیاز فتح پوری کے شہرت یافتہ رسالہ ''نگار'' میں بھی شائع ہوا ایم.اے.اردو کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ۱۹۵۱ء میں ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ''پرکھ'' کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا()۔

''بہار میں اردو تنقید کا ارتقاء'' کے عنوان سے پروفیسر،ڈاکٹر ابوذر عثمانی (رانچی) پہلا ،دوسرا ،اور آخر میں جدید دور کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''گذشتہ چند برسوں میں اردو میں جو چند لکھنے والے ابھرے ہیں ان میں بہار کے ایک نوجوان نقاد غلام سرور بھی ہیں۔سرور کی کتاب پرکھ ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آئی۔جس میں ان کے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک کے مضامین ہیں۔ان مضامین سے سرور کے تنقیدی شعور کا ارتقاء اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔سرور نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح زندگی کو روٹی، سیاست یا اشتراکیت تک محدود نہیں رکھتے۔ بلکہ ہر وہ شئے جس کا تعلق انسانی تمدن کے تاریخی ارتقاء سے ہے اسے زندگی میں داخل سمجھتے ہیں۔وہ یہ کہنے میں کوئی دریغ محسوس نہیں کرتے کہ ہر بڑے فنکار کو حیات کے متعلق اپنا زاویہ نگاہ رکھنا ضروری ہے۔مگر اسے پروپیگنڈہ کا شکار اور پرچار کا آدرش نہیں ہو جانا چاہئے، بلکہ فن پر بھی توجہ دینا چاہئے۔ سرور ادیبوں کو حالات وواقعات اور اصولوں کا غلام دیکھنا پسند نہیں کرتے۔وہ لکھتے ہیں کہ ادیبوں کو صرف ایک ازم یا ایک موضوع سے واقفیت نہیں پیدا کرنی چاہئے۔

سرور کے ان خیالات سے اعتدال اور توازن کے ساتھ ان کی وسعت نظر اور وحدت کا پتہ چلتا ہے۔سرور کے ان مضامین میں پوری طرح سے صداقت originality اور پختہ کاری تو نہیں ہے۔تاہم اگر وہ اپنی تنقیدی کاوشیں جاری رکھتے تو وہ اردو ادب میں اپنا ایک مقام ضرور بنا لیتے۔افسوس کے یہ قطرہ گہر نہ بن سکا۔''

(حوالہ ماہنامہ صنم، پٹنہ بہار نمبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۶۶)

پرکھ کے مصنف غلام سرور نے اپنے پیش لفظ میں یہ وضاحت پیش کر دی ہے کہ ان کے اس مجموعہ میں مقالات ''شہنشاہ حبشہ'' اور ''اقبال کی غزلیں''، عملی تنقید کا نمونہ ہیں اور سکسینہ کی تاریخ ادب اردو، ترقی پسند

تحریک اور مواد و ہئیت نظریاتی تنقید۔ عبدالمغنی نے غلام سرور کو گلستان تنقید کی ایسی کلی سے مثال دی ہے جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی ہو۔ اس مجموعہ میں انہوں نے نظریاتی اور عملی تنقید دونوں ہی کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں ۔اور ہر مقام پر غیر جانبدار رہے ہیں۔ ان کی تنقید میں تعمیری پہلو ہے اور جدید تقاضوں سے واقفیت بھی۔ ان کا مجموعہ اردو ادب میں ایک مستحسن کوشش اور بہار میں اردو تنقید کا اشاریہ ہے۔

(بحوالہ بہار میں اردو تنقید ص ۲۰۸)

’پرکھ‘ کا مقدمہ مشہور نقاد پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ) نے لکھا ہے۔ ’’اس میں سکسینہ کی ایک بڑی خامی کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ کہہ کر انہوں نے بہار کے شاعروں اور ادیبوں کو قریب قریب نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو ادب کی کوئی تاریخ راسخ عظیم آبادی، شورش، جوشش، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، سید قیصر حسین خیال اور خدا بخش لائبریری کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کوتاہی میں سکسینہ یا عسکری تنہا نہیں دوسرے لوگوں نے بھی بہار کی خدمات کا پورے طور پر اعتراف نہیں کیا ہے .... دراصل دلی اور لکھنؤ کی مرکزیت اور آمریت نے ادبی شخصیتوں اور کارناموں کو پوری طرح ابھرنے نہ دیا۔ غلام سرور کے اس مضمون میں جذباتیت، جوش و خروش طنز اور استہزاء زیادہ ہے۔ آل احمد سرور نے یہ بھی لکھ دیا کہ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔ غلام سرور ان نوجوانوں میں ہیں جو ایک پاکیزہ ذوق کے ساتھ ایک رچا ہوا شعور بھی رکھتے ہیں۔

پروفیسر اختر اورینوی شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی ’’پرکھ‘‘ کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ’’غلام سرور نے جس نگاہ سے ادب، تخلیق ادب، زندگی اور تحریکات زندگی کا مطالعہ کیا ہے، اس میں توازن پایا جاتا ہے۔ وہ بڑے سرگرم نوجوان ہیں۔ کام کرنے اور کیے جانے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص ترقی کو ضرور پسند کرے گا۔ لیکن غلام سرور نام نہاد ترقی پسندی کی کھوکھلی شورشوں سے آگاہ ہیں۔

غلام سرور کے چند تنقیدی مضامین اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ آگے چل کر وہ اردو کا ایک مشہور نقاد بننے کا امکان رکھتے ہیں۔ مگر مقام افسوس یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اور ایک پر آشوب دور کے آغاز کے بعد غلام سرور نے ملک اور ملت کی تقدیر سنوارے کے لئے اپنا کیریئر بھی داؤں پر لگا کر صحافت اور بعد میں سیاست کا راستہ اختیار کرلیا۔

بقول شخصے اگر وہ تنقیدی مضامین اور مقالے لکھتے بھی رہتے تو کیا ہوتا محض اردو پر تنقید نگاری میں ایک نام کا اضافہ۔

انہوں نے ایک اعلیٰ مشن کا خاردار راستہ منتخب کیا۔ اپنی اردو صحافت کے ذریعہ ایسے لوگوں خصوصاً نوجوانوں کو جو تقسیم ہند کے المیہ سے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اور احساس کمتری میں شدید طور سے مبتلا تھے، ان کے اندر عزم، حوصلہ، ہمت اور جرأت عمل بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر تو وہ (غلام سرور) اتنے مصروف ہو گئے کہ انہیں تنقیدی مضامین اور مقالے لکھنے کا موقع ہی نہ رہا۔

بہرحال غلام سرور کے چند تنقیدی مقالوں کا پہلا مجموعہ ’’پرکھ‘‘ پر ان کے کالج کے زمانہ کے ایک ساتھی کلیم سہسرامی کا چھ صفحوں پر مشتمل ایک جائزہ شائع ہوا۔ ہم مختصر میں اس جائزہ کو بھی پیش کرتے ہیں۔

’’لیکن حقیقت میں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ غلام سرور کی تنقید میں طنز و استہزاء نہیں ہے۔ رام بابو سکسینہ ہی نہیں بلکہ اکثر مورخین تاریخ ادب اردو نے دبستان لکھنؤ اور دہلی کے علاوہ دبستان عظیم آباد، حیدرآباد اور بعض دیگر علاقوں کے شعراء وادباء کی خدمات سے چشم پوشی کی ہے۔ جس کا برملا اظہار غلام سرور نے کیا اور مثالیں پیش کر دیں۔

’’پرکھ‘‘ اور دوسرا مقالہ ’’شہنشاہ حبشہ‘‘ مشہور ناقد پروفیسر اختر اورینوی کا ایک المیہ ڈرامہ ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی صاحب غلام سرور کے استاد رہ چکے ہیں اور سرور صاحب ان سے بڑی عقیدت اور احترام رکھتے تھے۔ مگر اپنے تنقید میں بڑی بے باکی سے اس کا تجزیہ کیا ہے اور اس ڈرامے کی کمزوریوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ غلام سرور نے اس ڈرامے کو ارسطو کے المیہ کے معیار پر بھی پرکھا ہے اور سنسکرت ڈرامہ ’’شکنتلا‘‘ اور امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ’’انارکلی‘‘ کے تقابلی مطالعے سے بھی کیا ہے۔ ’’شہنشاہ حبشہ‘‘ کے مصنف ڈاکٹر اختر اورینوی نے کرداروں کی اتنی بھرمار کر دی ہے کہ کوئی بھی کردار نمایاں طور سے نہیں ابھر سکا۔ اس ڈرامہ کو اسٹیج پر بھی پیش کرنا مشکل ہے۔

’پرکھ‘ کا تیسرا مقالہ اردو صحافت‘‘ بقول کلیم سہسرامی ایک تشنہ مقالہ ہے۔ اس کی حیثیت تحقیقی ہوتے ہوئے مزید وسعت کی طلب گار ہے۔

''پرکھ'' کا چوتھا مقالہ ''اقبال کی غزلیں'' اہم مقالہ ہے۔''اقبال کی غزلیں'' پر غلام سرور کے اظہار خیال سے ان کے ادبی شعور اور صحت مندانہ رجحان کا پتا چلتا ہے۔

اقبال نے اردو شاعری کو مفکرانہ عظمت دی اقبال نے اردو شاعری کو موضوع اور وسعت فکر عطا کی۔مواد میں انقلاب برپا کر دیا مگر اس کے ساتھ فنی اصولوں کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ان کی غزلوں میں تسلسل کے بے پناہ حسن کا احساس ہوتا ہے۔دراصل ان کا فلسفہ ان کی غزلوں اور شاعری کی روح ہے۔

'پرکھ' کا پانچواں مقالہ ''ترقی پسند تحریک'' غلام سرور کا اہم مقالہ شمار کیا جا سکتا ہے۔یہاں ایسا لگتا ہے کہ شاعری ہو یا افسانہ کمیونزم کا پروپیگنڈہ معلوم ہوتا ہے۔مقصدیت فن پر غالب ہے۔رجعت پسند تحریک کے ردعمل میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔پروفیسر آل احمد سرور نے ترقی پسند تحریک کے مقالہ نگار (غلام سرور) پر حسب ذیل رائے دی:

''بڑی خوبی سے ترقی پسندی کے عالمگیر عناصر کا تجزیہ کیا ہے۔............انگارے' پر جو رائے دی ہے وہ بھی ایک حد تک غلط نہیں کہ یہ مجموعہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے ادبی نہیں'' (حوالہ مقدمہ پرکھ)

پرکھ کا چھٹا اور آخری مقالہ ''مواد اور ہیئت'' بھی بہت اہم اور قابل مطالعہ ہے۔''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' ایک پرانی بحث ہے۔کچھ ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موضوع یا مواد کتنا معمولی ہی کیوں نہ ہو۔اگر اس کے کہنے کا انداز (ہیئت) نہایت عمدہ ہے تو اس کا شمار عمدہ ادب میں کیا جائے گا۔لیکن اس کے برخلاف دوسرے ناقدین کا یہ ماننا ہے کہ اعلی ادب کی تشکیل کے لئے اعلیٰ افکار و خیالات پر مبنی مواد کا انداز بیان (ہیئت) پر فوقیت رکھتا ہے۔تیسرا خیال یہ بھی ہے کہ جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے دراصل مواد اور ہیئت میں مکمل تعاون کا رشتہ ہونا چاہیے جیسے کہ جسم کا روح سے ہے۔

غلام سرور ادب برائے زندگی کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں۔انہیں کے الفاظ میں ''معنی، خیال، تجربہ، واقعہ اور حقیقت مواد کے مختلف نام ہیں اور لفظ، اسلوب تکنیک، صورت او ہیئت ان خیالات اور حقائق کو بیان کرنے کے طریقے............اور مختلف شکلیں ہیں۔

(حوالہ مقالہ مواد اور ہیئت، جو اس کتاب میں منتخب مضمون میں شامل ہے)

پرکھ کے ان تمام مضامین کا ہم نے ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا ہے۔جو مستقبل میں غلام سرور کے

اعلیٰ ناقد اردو ہونے کی بشارت ہے۔

''مقالات غلام سرور'' میں دیگر دس مضامین شامل ہیں۔ان میں مشہور شاعر حسرت موہانی پر بھی غلام سرور نے اظہار خیال کیا ہے۔یہاں پر حسرت کا مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔انہوں نے 'شعر' کی یہ تعریف شعر میں کی ہے۔

شعر در اصل وہی ہے حسرت
سنتے ہی جو دل میں اتر جائے

غلام سرور کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں کہ اردو والے شاید حسرت کو بھول گئے ہیں۔ہرگز نہیں۔اردو شاعری میں حسرت کا مقام محفوظ ہے۔وہ جنگ آزادی کی تحریک میں سرگرم تھے اور مکمل آزادی کا نعرہ انہیں کا دیا ہوا تھا۔

مقالات غلام سرور میں ان کے ایک مضمون کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔غلام سرور کے والد اپنے آبائی مکان میں سخت علیل تھے اور بستر مرگ پر تھے۔وہ بار بار اپنے واحد صاحبزادہ غلام سرور کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ان کی اہلیہ اور بیٹی انہیں یہ بتاتیں کہ وہ ابھی بہار سے باہر گئے ہوئے ہیں۔حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ جیل میں تھے۔وہاں سے چھوٹ کر آئے تو اس وقت ان کے والد بے ہوشی یا کوما میں جا چکے تھے۔غلام سرور ان کے پلنگ سے لگ کر ان کے کانوں میں آواز لگاتے رہے۔''ابا میں غلام سرور ہوں۔میں آ گیا ہوں۔'' مگر اب وہ کہاں سنتے۔آخر وقت میں غلام سرور کو کہاں دیکھ پاتے۔بس غالب کا یہ مصرعہ

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

غلام سرور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ان کے والد عبدالحمید صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔اللہ ان کو جنت الفردوس میں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

علامہ اقبال

''مضامین غلام سرور' میں ان کے ایک پرستار نے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

غلام سرور بنیادی طور پر ایک صاحب طرز صحافی، جادو بیان خطیب اور جرأت مند قائد کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اللہ نے ان کو بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد ادبی وتنقیدی شعور بھی ودیعت کیا ہے۔ ایم.اے. کے طالب علم کی حیثیت سے ہی انہوں نے تنقیدی مقالے تیار کئے تھے جو پرکھ کے نام سے شائع ہوئے۔ جس پر پروفیسر آل احمد سرور نے یہ لکھ دیا کہ توقع ہوتی ہے کہ توازن، وسعت نظر اور وحدتِ فکر سے مستقبل میں بہار اور اردو کو ایک اچھا نقاد مل سکتا ہے.................لیکن آزادی کے مابعد ایسا پر آشوب اور صبر آزما دور آیا کہ ایسے میں غلام سرور نے ملت کی صحیح رہنمائی اور ملک کی تعمیر نو میں حصہ لینا زیادہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے ادب کی جگہ صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور تحقیق وتخلیق کے بجائے متحرکات کی راہ پر چل پڑے۔

’’قومی ملی اور لسانی تحریک کی راہ میں حق گوئی وبے باکی کی پاداش میں متعدد بار جیل جانا پڑا۔‘‘

(حوالہ مرتب، غلام سرور مرکز، تحقیق پٹنہ، اشاعت ۲۰۰۰ء)

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ غلام سرور نے ایام طالب علمی میں شاعری بھی کی اور ایک افسانہ بھی لکھا مگر ناکام رہے۔

❋

ٹھیک پچاس سال پہلے

مذکورہ بالا عنوان پر غلام سرور کی ایک تحریر کے حوالہ سے یہ مضمون پیش خدمت ہے جو خود بہ قلم غلام سرور ۲۰/اپریل ۱۹۵۱ء میں درج ہے۔

’’آج سے ٹھیک ۵۰ سال پہلے اپنی تصنیف پرکھ کے پیش لفظ میں جو کچھ لکھا بعینہٖ آج پھر وہی دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

پھر اپنے شفیق والدین، اساتذہ اور ناقدین کلیم الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، احتشام حسین اور علامہ نیاز فتحپوری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ریاست بہار کی واحد سرگرم ادبی انجمن ’’حلقہ ادب‘‘ بہار کی تحریک نہ ہوتی تو میں یقینی وہاں نہ ہوتا جہاں آج ہوں۔

ادبی ذوق اسکول کے ابتدائی درجوں سے ہی رہا۔ ۷/اگست ۱۹۴۱ء کو رابندر ناتھ ٹیگور کی موت کی خبر سنی۔ اثر پذیر ہوا اور اسکول کی چہار دیواری میں ہی بیٹھا ایک چھوٹا سا مضمون لکھ ڈالا۔ میرے بزرگ استاد مولوی سید غنی حیدر صاحب نے میری ہمت بڑھائی.................جب میں انٹرمیڈیٹ میں آیا تو کچھ غزلیں اور ’کلرک‘ پر ایک نظم کہی۔ بزم سخن سائنس کالج کے سالانہ جلسے کے موقع پر انعامات حاصل کیے۔ جذباتی طور پر اثر ہوا اور جی چاہا بہت بڑا شاعر بن جاؤں، مگر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ شاعری اپنے بس کا روگ نہیں۔

جب بی.اے. میں تھا تو ایک بار ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر زندگی کا ایک پہلا اور آخری افسانہ بھی لکھ ڈالا۔ وہاں بھی ناکام رہا اور اس افسانہ کو آج تک کوئی سن سکا نہ دیکھ سکا۔ تھوڑے عرصہ تک صحافی کی زندگی گزاری اور دو پرچوں کی ادارت کے فرائض کی انجام دہی کی۔ مضامین، انشائیے اور اداریئے لکھتا رہا۔ پھر ایم.اے. میں پہنچا۔ ایک انعامی مقابلے میں حصہ لینے کی غرض سے ایک ایکٹ کی

ایک تمثیل ''اقبال میدان حشر میں'' لکھا۔لوگوں نے پسند کیا اور میں نے اسے 'نگار' میں بھیج دیا۔صوبے سے باہر یہ میرا پہلا قدم تھا۔ نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین صاحبان نے رائیں بھیجیں اور حوصلے بڑھائے ....لوگ حوصلے بڑھاتے گئے اور میں لکھتا رہا۔

(بہ حوالہ دستخط غلام سرور)

غلام سرور بی.اے. انگریزی آنرس کے طالب علم تھے۔اس لیے وہ انگریزی اور مغربی ادب سے بھی واقف ہو گئے تھے۔اور تنقیدی مضامین لکھنا شروع کیا اور اسی ڈگر پر چلتے رہے۔غلام سرور نے ایسے مضامین بھی لکھے جن میں ترقی شگفتگی، طنز و مزاح، ظرافت اور انشائیہ کے دلچسپ پہلو نظر آتے ہیں۔

غلام سرور کی مختصر ادبی زندگی گزارنے کے بعد ایک طویل سلسلہ ان کی صحافتی اور سیاسی زندگی میں بسر ہوا۔

اور اب پچاس سال بعد

''سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۲۰۰۱ء کے درمیان پچاس سال تک میری زندگی کے ہنگامہ خیز سال گزرے ہیں۔میری صحافت کا آغاز تو آزادی کے قبل ہی ہو گیا تھا۔ماہنامہ ''سماج'' افتخار احمد حسین آبادی (شیخ پورہ، مونگیر) نے شائع کیا اور مجھے بھی شریک کر لیا۔بہار صوبائی مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے زیر اہتمام 'نوجوان' ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا۔بہار میں اردو کا صرف ایک روزنامہ 'صدائے عام' شائع ہوتا تھا جو سید نظیر حیدر مرحوم نے سن ۱۹۴۲ء میں نکالا۔سن ۱۹۴۹ء میں بہار کے وزیر تعمیرات عامہ عبدالقیوم انصاری کی سرپرستی میں سہیل عظیم آبادی روزنامہ ''ساتھی'' نکالتے تھے۔اس کی مالی حالت دگرگوں ہونے لگی۔میں نے سہیل عظیم آبادی کو دس ہزار روپے دے کر روزنامہ ''ساتھی'' خرید لیا............میں نے ''ساتھی'' کا سالنامہ نکالا۔جس کے بعد ''ساتھی'' تھونس گیا............اور میں نے مفت میں اپنے مینیجر کے حوالہ کر دیا۔۱۰/اکتوبر ۱۹۵۳ء سے اپنے وطن دانا پور کینٹ کے ایک کمرہ سے ''سنگم'' ہفتہ وار کا اجرا کیا۔سن ۱۹۵۶ء میں سنگم ویکلی کا دفتر لالہ زار منزل دریاپور منتقل ہو گیا، جہاں سے سن ۱۹۶۳ء میں روزنامہ ہو گیا۔اور جب ملک میں شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند نے ایمرجنسی لگا دی تو دوبارہ ۲۶/جولائی ۱۹۷۵ء کو سنگم کو عملہ کے حوالے کر کے سبکدوش ہو گیا۔اور سیاست میں شب و روز گزرنے لگے۔

جب ڈاکٹر شری کرشن سنہا بہار کے وزیر اعلی تھے تو سنگم میں ان کے اداریہ 'خدا خیر کرے' پر دفعہ ۱۵۳ (الف) کے تحت ۱۹۵۸ء میں مقدمہ ہوا۔پھر تو جیل کی کوٹھری میں عدالت کا کٹہرا ان کے لئے گھر آنگن ہو گیا............پھر تو مقدمات کی بھرمار ہو گئی............کل تین درجن مقدمات اُن پر ہوئے مگر میرے اللہ نے ان سب سے بری کر دیا............

جب سقوط (مشرقی) پاکستان اور بنگلہ دیش کے دوران مشرقی پاکستان مقیم میں غیر بنگالی

مسلمانوں پر شیخ مجیب الرحمٰن کے گرگوں نے قہر ڈھایا تو میں نے بھی بہار بچاؤ کی تحریک چلائی۔ مجھ پر ایک مقدمہ اس سلسلہ میں بھی پٹنہ ہائی کورٹ میں ہو گیا۔

ایک مقدمہ میں (غلام سرور) ہزاری باغ، سینٹرل جیل میں قید تھے۔ مقدمہ کی پیروی کے لیے ان کی درخواست کی منظوری پر ہزاری باغ سے پٹنہ بانکی پور جیل لایا گیا۔ ایک دن کے بعد ہی گرمیوں کی تعطیل ہونے والی تھی۔ ایڈووکیٹ جنرل نے بحث کو طول دے دیا تھا۔ غلام سرور کے وکیل نے پوچھا اب کیا کیا جائے۔ غلام سرور نے کہا کہ میں نے اپنا جو بیان داخل کیا ہے اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے............ چیف جسٹس نے فیصلہ لکھوانا شروع کر دیا۔ اسٹینو کو آخری جملہ لکھوایا کہ عرضی گزار کو اسی وقت اور یہیں رہا کیا جاتا ہے۔ جج کے منصفانہ فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ان کی والدہ، بہن اور بیوی عدالت میں آخری بنچ پر سانس روکے بیٹھی تھیں۔

''مقدمات کا سلسلہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۲ء تک جاری رہا......۱۹۶۴ء کے بعد ۱۹۷۲ء تک تقریباً ہر سال جیل جاتے رہے۔

۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے حملہ کر کے مصر اور شام کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تو ہم (غلام سرور) نے تحفظ فلسطین کانفرنس منعقد کی۔

سن ۱۹۵۱ء میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا...... بہت جلد اس نے اپنی پہچان بنالی۔ دس لاکھ دستخط حاصل کر کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

سن ۱۹۶۱ء میں اور سن ۱۹۷۱ء میں مردم شماری میں مادری زبان اردو درج کرانے کی مہم چلائی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستی اردو کانونشن پنڈت سندر لال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اردو ۱۹۶۷ء کے عام انتخاب کا موضوع بن گئی۔ اردو تحریک رنگ لاتی رہی۔ حکومت وقت کا تختہ پلٹ گیا۔ بہار میں پہلی بار مہامایا پرشاد کی وزارت اعلی میں پہلی بار غیر کانگریسی سرکار بن گئی۔ میں نے وزیر بننے سے انکار کر دیا۔

''سن ۱۹۷۷ء میں سیوان سے چناؤ لڑا، جیت گئے اور وزیر تعلیم بنایا گیا۔ وزیر اعلی کرپوری ٹھاکر تھے۔''

سن ۱۹۹۰ء عیسوی میں کیوٹی ضلع دربھنگہ سے چناؤ جیت کر آئے اور بہار قانون ساز اسمبلی کا

اسپیکر ہوئے۔ پھر سن ۱۹۹۵ء میں میں کیوٹی سے دوسری بار کامیاب ہوئے اور وزیر بنائے گئے اور جب تیسری بار (کیوٹی سے ہی) کامیاب ہوئے تو وزیر زراعت ہی رہے۔

اسی دوران ہندوستان میں پہلی بار آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کانفرنس پٹنہ میں منعقد ہوئی اور غلام سرور ہی جنرل سیکریٹری تھے۔

(غلام سرور ۲۵ راپریل ۲۰۰۱ء)

غلام سرور کی صحافتی زندگی

ہندوستان کی پہلی مشترکہ جنگ آزادی کی تحریک (۱۸۵۷ء) ناکام ہوگئی۔حکومت برطانیہ کے نمائندوں نے اسے غدر کا نام دیا۔قارئین اس بات سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے انگریز اس ملک میں تاجر بن کر آئے تھے اور پھر حکمراں بن بیٹھے۔وہ اپنی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر گامزن تھے۔اس کے آخری ایاّم میں انہیں حکومت سے دست بردار ہونا پڑا اور اقتدار کی منتقلی میں ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

''تقسیم کے المیہ'' سے غلام سرور بہت ملول اور افسردہ تھے اور اضطرابی کیفیت میں تھے۔وہ اس وقت اپنی ادبی ذوق کی سرگرمیوں اور تعلیم کے آخری مرحلے میں منسلک تھے۔اس وقت انہیں تحریک آزادی پر لکھنے کا موقع بھی نہیں تھا اور میری نظر میں بھی ان کی کوئی نمایاں تحریر نظر نہیں آئی۔ان کی ادبی زندگی کے بعد ہی ان کی صحافتی زندگی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا جس میں ان کا ادبی ذوق بھی برقرار رہا۔

اس صورتحال میں جہاں ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت جو کروڑوں پر مشتمل تھی مایوسی اور محرومیت کے احساسات میں مبتلا تھی،اس وقت کسی کا کھڑا ہونا بڑی جرأت اور بہادری و دلیری کا کام تھا۔ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرنا جو امید افزا ہو،جو ہمیں گھروں سے نکل کر اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کرے۔

ایسے میں ایک نوجوان فکر میں غلطاں ہوتا ہے۔وہ عزم حوصلہ اور خود اعتمادی سے متحرک ہوتا ہے۔اپنے کچھ دوستوں کو دعوت تحریک دیتا ہے۔بہار صوبائی مسلم فیڈریشن کا قیام کرتا ہے۔خود اس کا جنرل سکریٹری ہوتا ہے۔اور ایک ہفتہ وار ''نوجوان'' پٹنہ کے اجراء کا فیصلہ کرتا ہے۔اس نوجوان کا نام غلام سرور تھا۔وہ اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھا۔اس نے رسالہ ''نوجوان'' کا ''ہم کیا کریں'' کا نمبر جنوری ۱۹۴۸ء میں شائع کیا۔

سرورق پر اقبال کا حسب ذیل شعر تھا:

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

غلام سرور نے صرف بہار ہی نہیں ہندوستان بھر سے مسلم مفکرین اور اہل علم کو اس موضوع پر ''ہم کیا کریں'' لکھنے کی دعوت دی۔ان سے مشورہ طلب کیا حسب ذیل افراد کے مضامین حاصل کرنے میں اسے کامیابی ملی۔لکھنے والے افراد کے نام درج ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، مدیر صدق لکھنؤ
مرزا محمد اسماعیل خان، وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مشتاق حسین، صدر، بہار صوبائی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن
ایم ایم شریف مجاہد، سکریٹری، مدارس مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن
ڈاکٹر عبدالحمید قاضی، ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) مدیر روزنامہ مسلم، ممبئی
علی اشرف، سکریٹری بہار صوبائی کمیونسٹ پارٹی
پروفیسر اختر اورینوی، شعبہ اردو، پٹنہ کالج
سید محی الدین احمد، رانچی
مولانا عبدالخبیر، امیر جماعت اہل حدیث، صوبہ بہار
پروفیسر مناظر احسن گیلانی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد
ڈاکٹر امیر الدین قدوائی علیگ، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد
پروفیسر اختر انصاری
پروفیسر معین احسن جذبی وغیرہ وغیرہ

اس نمبر کے شروع میں غلام سرور کا اداریہ ہے۔حالانکہ نام درج نہیں ہے اور یہ شعر درج ہے :

جہاں بنی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

انہوں نے اس شعر میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ 'جہاں بنی' ان کی فطرت میں شامل

ہے،لیکن انہیں کسی جمشید کے ساغر بننے میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز اور اپنی فکر پر بھروسہ کرتے تھے۔'نوجوان' کے 'ہم کیا کریں' نمبر کے اداریہ میں لکھتے ہیں: آج سیاست ایک پگھلے ہوئے مادے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔اسے ٹھوس اور حسین شکل دینے کی ترکیب ہندوستان کا ہر اہل فکر اپنے طور پر کر رہا ہے۔اس غیر معمولی اشاعت میں ہم نے صرف اس قدر کیا ہے کہ تمام ماہرین سیاست و مفکرین ملت سے ان کی وہ سچی رائے طلب کر لی ہے جس میں وہ اس سیال مادہ کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جس کو وہ مسلمان کا حرف آخر تصور کرتے ہیں۔ ہندی مسلمان ایک ایسے موڑ پر آ کر ٹھٹک کر رہ گیا ہے جہاں سے مختلف راہیں نکلتی ہیں۔مختلف رہبر ہیں جو اسے مختلف راہوں پر چلنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔اور ان رہنماؤں نے گم کردہ راہ مسافروں کو صحیح راہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔تقریباً تمام تر حضرات ذہنی طور پر کسی تحریک سے متاثر ہیں اور بہتیرے مضامین ذاتی اور انفرادی رائیں ہیں۔اور اکثر مضامین جماعتوں کے حقیقی ترجمان۔

''قدرتی طور پر آپ چاہیں گے کہ ہمارے خیالات بھی آپ کو معلوم ہو جائیں تو آپ پریشان نہ ہوں۔آئندہ اشاعت میں ہم اس مسئلے پر مفصل اظہار خیال کریں گے اور تمام تر مسائل پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔''

ڈپٹی کلکٹر کا یہ بیٹا غلام سرور میٹرک تا ایم .اے. کے امتحان میں شاندار طور پر اول درجہ میں کامیاب ہوتا رہا۔گولڈ میڈلسٹ بھی تھا۔وہ چاہتا تو بڑی سے بڑی نوکری اس کے قدم چوم سکتی تھی۔مگر اس نے بہت سوچ کر اردو صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔تاکہ وہ ملک و ملت کی خدمت کر سکے۔ یہ صحافت اس کی اپنی پسند کی تھی۔اس نجی صحافت کے نشیب و فراز کے کتنے ہی صبر آزما مقامات آتے رہے۔مگر وہ دل برداشتہ نہ ہوا۔

غلام سرور نے اردو صحافت اور اردو کا پرچم سوچ سمجھ کر اٹھایا اور مسلمانوں کو راستہ دکھانے کی کوشش کی چونکہ اردو ہندوستان کی ایسی زبان بھی ہے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مشترکہ زبان تھی۔گنگا جمنی تہذیب کی شاندار علامت تھی۔گرچہ تقسیم ہند کے بعد اردو زبان بھی معتوب ہو گئی تھی۔اسے مسلمانوں کی زبان کہا جانے لگا۔اس پر 'تقسیم کی زبان' کا لیبل بھی چپکایا گیا۔

غلام سرور کی صحافت 'نوجوان' ہفتہ وار پٹنہ سے شروع ہوئی۔اس کا یہی ایک شمارہ اتفاق سے

میرے پاس موجود ہے۔جنوری ۱۹۴۸ء سے پہلے اور بعد میں اور کتنے شمارے شائع ہوئے میں نہیں جانتا اور یہ ہفتہ وار کب بند ہوا اس سے بھی واقف نہیں۔لیکن غلام سرور اپنے عزم میں پست نہیں ہوا۔اس نے 'ساتھی' اخبار خریدا۔اس وقت اس کے ایڈیٹر سہیل عظیم آبادی تھے۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد خود اپنا اخبار ''سنگم'' ہفتہ وار شروع کر دیا جو دانا پور سے شائع ہوتا تھا۔

سنگم ہفتہ وار اخبار کا پہلا شمارہ ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۳ء ہے۔ پرنٹر و پبلیشر ہیں ایم.اے.نعمان، مطبع آزاد پریس، بانکی پور پٹنہ ہے۔اس کے پہلے شمارے میں غلام سرور کا اداریہ اور پالیسی کی وضاحت ہے۔

۱۹۶۲ء کے بعد ''سنگم'' روزانہ ہو گیا اور غلام سرور کی نگرانی اور ادارت میں ۱۹۷۵ء تک رہا۔ اس کے بعد اپنے اسٹاف کے حوالہ کر دیا۔

سنگم کا پہلا اداریہ

سنگم کے نام سے ہی (مورخہ ۱۰/۱۱ اکتوبر ۱۹۵۳ء) غلام سرور کے الفاظ ہیں:

''آخر سنگم کی پالیسی کیا ہوگی؟ کن دھاروں کا سنجوگ ہے۔ یہ کن راہوں کا سنگم ہے۔ یہ کن مدرسہ ہائے فکر کی فریاد ہے؟ یہ سوالات بادی النظر میں جتنے آسان عام اور ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں دراصل ان کا جواب اتنا ہی دقت طلب، پریشان کن اور دشوار گذار ہے۔ وہ اس لیے کہ آج کی بیسویں صدی کی دنیا جسے ایٹم بم سے آگے ہائیڈروجن بم کی دنیا تصور کیا جاتا ہے جہاں سیکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں لاینحل عقیدے یوں ہی پڑے ہیں۔ جہاں ہر روز ایک نئی پیچیدگی، ایک نیا مسئلہ اور ایک نئی کھٹائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہاں دو کالم میں ایک ایسے جریدہ کی پالیسی کا تعین کر دینا مشکل امر ہے جو ہر ہفتہ شائع ہوگا۔ اور اپنے کالموں میں ولا ڈی و اسٹیک سے انڈونیشیا، امریکہ سے جاپان، ایورسٹ کی فلک بوس چوٹیوں سے پیسیفک کی اتھاہ گہرائیوں تک، افریقی حبشیوں سے جرمنی تک، ترک وعرب مسلمانوں، امن پسند ایشائیوں، سامراجی فرنگیوں تک کے ہر مسئلے پر رائے زنی کرے گا۔ پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو سنگم کی پالیسی کا ایک سرسری خاکہ کھینچ کر دکھا دیں۔

سب سے پہلے آپ ہماری پالیسی کا اندازہ ہمارے نام سے لگا سکتے ہیں۔ سنگم ہفتہ کے سات دنوں کے واقعات، حوادث، خبریں، رایوں اور کوائف کا سنگم ہوگا۔ سنگم اردو کا خادم اعظم ہوگا۔ مگر سنگم کو دنیا کی کسی دوسری زبان سے مخاصمت کی بجائے دل چسپی ہوگی۔ سنگم دنیا کے سارے انسانوں سے منفرد ہونے کی بجائے ان سے میل جول، محبت پریم اور خلوص سے رہنے کا پیغام دے گا۔ سنگم اپنی آزادی کی خاطر جان کی بازی لگانے کی ترغیب دے گا۔ مگر ساتھ ہی وہ عالمی امن، پائیدار شانتی، سکھ چین، صلح وآشتی کے لئے کوشاں ہوگا۔ سنگم ایک ایسا سنگم ہوگا جہاں انسان ملتے ہوں۔ اس کی پالیسی یہی ہوگی کہ آزاد رہیں اور میرا مسلک

ہے صلح کل۔ کسی کی حاشیہ نشینی سنگم کبھی نہ کرے گا۔

یہاں میں ایک بات دوہرا دوں کہ غلام سرور کے نقطہ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کی آزادی اور ''تقسیم کا المیہ'' جو ملک کے ''نوجوان'' ہفتہ وار پٹنہ میں پیش کیا گیا تھا، وہ ابھی بھی برقرار تھا یعنی ''جہاں بینی'' ان کی فطرت میں قائم رہے گی اور وہ کسی جمشید کا ساغر بننا پسند نہیں کریں گے چاہے وہ کتنا دل پذیر کیوں نہ ہو۔ اظہار بیان کی آزادی، حق وانصاف کی، امن وشانتی اور دلوں کے سنگم کی باتیں کرتے رہیں گے۔ ان کی اس فکر اور زاویہ نظر پر ہر شخص 'مرحبا' کیوں نہیں کہے گا۔

غلام سرور کے حسب ذیل الفاظ بھی ''سنگم'' فروری ۱۹۵۴ء میں موجود ہیں۔ ''ایماندارانہ صحافت کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی واقعے پر لبوں کو سی کر بیٹھے نہ رہا جائے بلکہ اپنی رائے ضرور دی جائے۔ وہ رائے موافقت میں ہو یا مخالفت میں۔ خاموشی بزدلی کی نشانی ہے۔ (مجلّہ غلام سرور، مرکز تحقیق ۱۹۶۶ء صفحہ ۳۲)

ان کی ایک دوسری تحریر بھی حسب ذیل ہے۔

'میری ناقص رائے میں یہ ناممکن ہے کہ خالصتاً صرف مسلمانوں کی کوئی پولیٹکل پارٹی اس ملک کے موجودہ ڈھانچے میں موثر اور فیصلہ کن رول ادا کر سکے گی۔

ہم پروفیسر اختر اورینوی کے ایک مضمون کے مختصر طور پر کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں: رسالہ ''نوجوان'' کے مدیر غلام سرور اپنے کچھ کارکنان کے ساتھ اختر اورینوی، شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی سے ملاقات کر کے ان سے اس نمبر کے لئے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ اختر اورینوی کے لفظوں میں ''میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ تاہم ایک سانس لینے والا، وجود تو رکھتا ہوں۔ زندگی سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔

''ہم کیا کریں'' اس سوال کے اندر ایک ذہنی مایوسی کا پرتو نظر آتا ہے۔ موجودہ دور میں انڈین یونین کے رہنے والے مسلمان بہت ہی زیادہ پریشان، مضطرب اور مایوس نظر آتے ہیں۔ میں خود بھی ان میں کا ایک فرد ہوں۔ آخر مسلمان کو اس سوال کی ضرورت کیوں آپڑی............؟

ہندوستان میں خدا نے ہمیں صرف حکومت کرنے کے لئے نہیں بھیجا تھا................!

مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنے دلوں سے مایوسی کو نکال دینی چاہئے................!

ہم ایک بے مثل تہذیب، ترقی پذیر نظام حیات کے حامل ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس مقصد زندگی

کو ہندوستان کی مظلوم قوموں اور عموماً سارے ہندوؤں، سارے سکھوں، سارے عیسائیوں اور سارے پارسیوں تک محبت کے ساتھ پہنچائیں۔ ہر چند کے یہ دور جمہوریت ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی سلطنت میں حصہ داری کا حق پہنچتا ہے ....ہم ایک دو دفعہ ضرور ہٹلر انا تقریریں سنتے رہتے ہیں.................فسطائیت کا سب سے بڑا ریلا جمہوریت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔اشتمالیت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس وقت کئی نصب العین حریصانہ طور پر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے لئے تگ ودو کر رہے ہیں۔کسی کے اندر محبت کا عنصر نہیں۔انصاف اور حق پسندی کا عنصر نہیں۔ہم اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کریں ہمیں کسی سے دشمنی نہیں۔ہم سب خدا کے بندے ہیں۔(حوالہ ’نوجوان‘ ۱۹۴۸ء صفحہ ۷۷)۔

ہم اپنے ’’ایمان مفصل‘‘ کے مطابق ایک قادر مطلق کے احکام اور ہدایت پر ساری انسانیت اور انسانی قدروں کے علمبردار ہیں۔اختر اورینوی کے حسب بالا الفاظ ستر سالوں کے بعد بھی ویسے ہی ہیں۔

غلام سرور نے اپنی طالب علمی کی زندگی کے آخری دور میں ہی ’’اردو صحافت‘‘ سے ملک و قوم کی خدمت کے لیے اپنا سفر شروع کیا۔وہ اردو کے علاوہ ایک انگریزی اخبار انگریزی زبان میں بھی نکالنا چاہتے تھے اور اس اخبار کا نام "Independent" کے نام سے اعلان کیا۔لیکن بدقسمتی سے کوتاہ نظر لوگوں نے ان کے مشن کو نہیں سمجھا اور نظر انداز کیا۔وہ خود اتنے دولت مند نہ تھے کہ ایک انگریزی اخبار کے اخراجات برداشت کرتے۔ان کا یہ اعلان صرف اعلان ہو کر رہ گیا۔پھر بھی ان کے قدم رکے نہیں۔تحریر کے علاوہ بے مثال مقرر بھی تھے۔

وہ ’صحافت‘ کی حسب ذیل تعریف پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

’’صحافت عربی لفظ ہے۔جس کے لفظی معنی صحیفہ نگاری کا فن ہے۔انگریزی لفظ جرنلزم کا ماٰخذ بھی لاطینی لفظ Journal ہے۔صحیفہ اور Journal ہم معنی مماثل الفاظ ہیں۔صحافت اطلاعات کی فراہمی اور ان کی ترسیل، توسیع، تبلیغ، نشر و اشاعت کا فن ہے۔اور اس کے معیار کو پرکھنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ صحافی نے اپنی تبلیغ کو کامیابی کے ساتھ کوچہ، بازار، گلی گلی، گھر گھر، دکان دکان، دفتر دفتر اور ہوٹل، کلب اسکول کالج، یونیورسٹی تک پہنچایا یا نہیں؟ صحافی کو سیاست کا حریف کہا گیا ہے۔جس کی کسوٹی وہ ہے جو

اصولوں اور قدروں کو پرکھے اور جس کے پیمانے اور ٹھکرے حوادث کو تولنے کا کام کر سکیں۔وہ تو اس پیچیدہ مسائل اور اختلافات سے بھری دنیا میں عدل و انصاف کی عدالت کے جج کی طرح کرسی پر جم کر بیٹھتا ہے اور فریضہ انصاف ادا کرتے ہوئے ہر موضوع پر، حادثہ پر، واقعہ پر اپنا دوٹوک فیصلہ صادر کرتا ہے۔وہ بہ یک وقت سماج اور قوم بلکہ انسانی برادری کا رہنما، ناصح، معالج، وکیل اور مشیر ہوتا ہے۔‘‘

(’’حوالہ بہار میں موجودہ اردو صحافت‘‘ سنگم سلور جبلی ۸۷ صفحہ ۳)

اپنے ایک اور مضمون ’’جنگ آزادی میں صحافیوں کا رول‘‘ میں رقمطراز ہیں:

’’جہاں غلام ہندوستان میں صحافی کا ایک کلیدی کردار ہوا کرتا تھا وہاں اب مابعد آزادی بھی اس کا رول کم اہم نہیں، کیونکہ بے شمار قربانیوں کے بعد جب ملک آزاد ہوا ہے تو اس کی آزادی، سالمیت، سرحد، وقار آبرو کی حفاظت بھی ہر ایک کے فرائض میں داخل ہے۔اور ظاہر ہے صحافیوں کی ذمہ داری دوسروں سے کم تر نہیں ہے‘‘

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو ۱۴/۱ اگست ۸۳ء)

کل ہند اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا پٹنہ میں انعقاد ہوا، اس میں غلام سرور بحیثیت ایڈیٹر سنگم بھی خصوصی طور سے شامل ہوئے تھے۔اردو صحافیوں کے مسائل اور مطالبات میں غلام سرور نے ہی کلیدی حیثیت میں اندرا گاندھی، وزیر اعظم ہند کے روبرو اظہار خیال کیا۔

کلکتہ میں تحریک آزادی کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد کے ادبی جلال و جمال سے لبریز ’’الہلال‘‘ اور پھر ’’البلاغ‘‘ کی تحریریں شائع ہو کر منظر عام پر آرہی تھیں۔بہت سارے اردو کے باذوق حضرات ان کے آئندہ شمارے کے مطالعہ کے لئے منتظر رہتے۔اسی طرح پٹنہ بہار سے ہفتہ وار ’’سنگم‘‘ اور اس کے بعد روزنامہ ’’سنگم‘‘ مابعد آزادی اخبار کی دوسری صبح کو قارئین ’’سنگم‘‘ بے چین و بےقرار رہتے کہ آج دیکھیں ’’سنگم‘‘ اخبار کی خاص سرخی کیا ہے۔غلام سرور اپنے اخبار میں خبروں کی سرخی لگانے میں ماہر تھے۔اور اسی طرح اظہار خیال میں بے باک اور نڈر۔ان کے اداریے بھی عام فہم زبان میں ہوتے تا کہ عوام تک ان کی آواز پہنچ جائے۔اس عام فہم زبان کی بھی یہ خوبی تھی کہ انہیں ادبی شان کی مترنم اور نازک لہریں چھوتی ہوئی گزر جاتیں۔

انہوں (غلام سرور) نے کئی اداریے تحریر کیے جو مقبول اور یادگار ہوگئے۔افسوس کے ان کے منتخب اداریوں کی کوئی مرتب شدہ کتاب شائع نہ ہوئی۔ایک اداریہ میں اس کے پورے دو کالموں میں کسی واقعہ پر مبنی علامہ اقبال کا یہ شعر لکھ دیا

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ایک دوسرے موقع پر کسی گستاخ رسول نے ایک کتاب شائع کی اور ایسا بعد میں بھی ہوتا رہا۔کسی نے ان کی فرضی تصویر شائع کی تو کسی نے ان کے خلاف نازیبا الفاظ اور بیان جاری کیا۔اس سے ایک فرقہ کے جذبات مجروح ہوئے احتجاج بھی ہوئے۔غلام سرور نے سنگم کے اداریہ میں یہ شعر لکھ دیا :

جو جان چاہو تو جان دے دیں، جو مال چاہو تو مال دے دیں
مگر یہ ہم سے کبھی نہ ہو گا نبی کا جاہ و جلال دے دیں

ایک تیسرا اداریہ بھی بہت حیرت انگیز ہے۔کسی خاص احتجاج کی وجہ سے ان کے اس دو کالمی میں اداریہ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔صفحہ کسی تحریر سے خالی تھا۔

زبان خشک ہے اور چپ ہے......ان حریفوں کی کم ظرفی پر
خالی اداریہ کے صفحہ کو دیکھ کر مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔

جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

شاید ملک میں سیکڑوں ہزاروں فرقہ وارانہ فسادات کے مدنظر یہ احتجاج ہوا۔

ان کی تحریریں اداریئے ایسے ہیں جو ہمیں عمل اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

اردو کے ہی ایک معروف صحافی ریحان غنی نے اپنے مضمون ''غلام سرور ایک صاحب طرز صحافی ''میں حسب ذیل حقیقت کو تسلیم کیا۔

''غلام سرور کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ''نوجوان'' سے لے کر ''سنگم'' تک جہاں بنی کو اپنی فطرت بنایا اور کسی جمشید کا ساغر نہیں ہوئے۔غلام سرور کا یہی کردار ہے جس نے ان کے قلم کو

طاقت عطا کی اور اسی طاقت نے صاحب طرز صحافی بنایا۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر ادیب، ہر صحافی اور ہر قلمکار صاحب طرز نہیں ہوتا۔کچھ ہی اہل قلم ایسے ہوتے ہیں جن کی تحریریں پہچانی جاتی ہیں کہ یہ کس کی تحریر ہے۔یہی پہچان دراصل کسی اہل قلم کے صاحب طرز ہونے کی علامت ہے۔غلام سرور بھی بلاشبہ ایسے ہی اہل قلم میں سے ایک تھے۔وہ ایک ایسے صحافی تھے جن کی تحریر کا انداز جداگانہ تھا۔ایک ہی سانس میں بلا جھجک اور بلا روک ٹوک۔لیکن پورے اعتماد کے ساتھ اپنی باتیں اس طرح پیش کرنا کہ تمام باتیں قاری کے ذہن دل اور دماغ میں اترتی جائیں،ایک بڑا فن ہے۔یہ فن غلام سرور کو معلوم تھا۔''

انہوں نے اپنے بیان کی موافقت میں غلام سرور کی ایک تحریر جو ۱۹۴۹ء کی ہے پیش کرتے ہوئے کہا۔ادب کا دامن کہیں نہ چھوٹنے پائے۔اس کا خیال ہمیشہ ادیب کے دل میں موجود ہونا چاہیے ورنہ وہ ادب نہیں پریس نوٹ ہو کر رہ جائے گا۔یا کسی مبلغ کا وعظ،کسی سیاسی جماعت کا لٹریچر یا پھر کسی ملک کے ریڈیو کی خبر۔''(نوجوان،یکم مئی ۱۹۴۹ء)

(حوالہ زبان وادب جنوری ۲۰۱۲)

ایک دوسرے معروف صحافی ریاض عظیم آبادی غلام سرور (مرحوم) کو ایک بلند پایہ ادیب اور صحافی کا خطاب عطا کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو:

''غلام سرور ہندوستان کے صحافیوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور ہرفن مولا صحافی تھے۔یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ انہیں ایک صحافی اعظم کہا جائے یا ایک مایہ ناز ادیب! یہ امر قابل قبول ہے کہ انھوں نے صحافت کو عملی میدان بنایا۔غلام سرور ایک متوازن ناقد،بہترین تمثیل نگار،شاندار خاکہ نگار،معتبر تاریخ نویس اور اپنے قلم کے مانے ہوئے بے تاج بادشاہ تھے۔ان کا اداریہ، واقعاتی رپورٹ بھی ایک ادبی شاہکار سے کم نہیں ہوتا تھا۔''

(حوالہ زبان وادب جنوری ۲۰۱۲ء ص ۶)

غلام سرور نے خود کو اردو صحافت تک محدود نہیں رکھا۔انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اردو زبان وادب کی ترقی ملک اور اس کے بسنے والوں کے لیے بھی ضروری ہے تاکہ گنگا جمنی تہذیب کو فروغ ملتا رہے۔انہوں نے ''حلقہ ادب'' کا قیام کیا اور پھر اردو تحریک کی جانب توجہ کی۔بہار میں اردو تحریک کا آغاز باضابطہ

۱۹۵۰ء- ۱۹۵۱ء سے آغاز ہو چکا تھا۔

بہار کی اردو تحریک کی ابتداء ''بہار ریاستی انجمن ترقی اردو'' کے قیام سے ہوئی۔ اور غلام سرور اس کے پہلے جنرل سیکرٹری منتخب کر لیے گئے۔ طالب علمی کا دور فوراً ہی ختم ہو چکا تھا۔ اپنے ایام جوانی سے ہی پورے جوش وخروش اور خود اعتمادی سے میدان عمل میں کود پڑے۔ ایک عہدے دار کی حیثیت سے انہوں نے اردو دوستوں کے لئے اپنا پہلا کتابچہ پیش کیا۔ ان کی تحریر کا ایک حصہ حسب ذیل ہے۔

''۵۰ سال پہلے بہار کے دارالسلطنت پٹنہ کے وھیلر سینیٹ ہال میں راجندر، عبدالحق سمجھوتہ پر دستخط ہوا۔ سن ۱۹۳۸ء کا یہ واقعہ ہے۔ اردو تحریک کی تاریخ میں پورے برصغیر کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ عجب اتفاق کہ اس تاریخی واقعہ کا سہرا بھی بہار کے سر بندھا۔ تب آنجہانی راجندر پرشاد ناگری پرچارک سبھا (ناگپور) کے صدر اور مولانا عبدالحق مرحوم انجمن ترقی اردو ہند (حیدرآباد) کے جنرل سیکریٹری ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی راہ میں ہندوستان میں آزادی کی لڑائی اب اپنے فیصلہ کن مرحلے میں پہنچ چکی تھی اور ملک کا ہر طبقہ، ہر فرقہ، ہر علاقہ، ہر لسانی گروہ آزاد ہندوستان میں اپنے روشن مستقبل کا خواب دیکھنے لگا تھا۔ ہندی پریمی کہتے تھے کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندی بہ خط دیوناگری ہوگی اور اردو والے کہتے تھے کہ اس کی حقدار اردو ہے۔ یہ لہجہ تلخ بحث اختیار کر رہا تھا۔ گاندھی جی نے بیچ کا راستہ نکالا اور یہ تجویز پیش کی کہ آزادی کے بعد ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی۔ جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی اور یہی معاہدہ آج سے ٹھیک پچاس سال پہلے پٹنہ کے وھیلر سینیٹ ہال میں راجندر پرشاد اور عبدالحق کے درمیان ہوا۔ جو راجندر حق پیکٹ کہلایا''

(حوالہ بہار میں اردو تحریک کے پچاس سال از غلام سرور صدر، انجمن، کتابچہ مطبوعہ ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء)

حکومت برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کے حکم پر ان کے نمائندوں نے ۱۴/۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کا المناک طور پر بٹوارہ کر دیا۔ کانگریس کے رہنماؤں کا موقف تھا کہ ''سارا ہندوستان ایک ہے۔ تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں تو بمبئی سے مسٹر جناح نے بانگ دی کہ ایسا نہیں ہے۔ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔

اس کی تلافی نہیں ہو سکی۔'' (غلام سرور، اسپیکر، بہار قانون ساز اسمبلی کا ایک مضمون، مجلّہ ۷۰ ویں سالگرہ)

ہندوستان میں آزادی کے بعد اردو بھی معتوب ہوگئی۔ راجندر-عبدالحق پیکٹ کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان بہ خط دیوناگری تسلیم کرلیا گیا۔ اور ہندوستان میں حکومت کی طرف سے سہ لسانی زبان کا فارمولہ نافذ کیا گیا۔ جو اس طرح ہے۔

(۱) ہندی بہ خط دیوناگری ہندوستان کی قومی زبان ہوگی۔ جو سب کے لئے لازمی ہوگی۔

(۲) ہندوستان کی دوسری جدید محفوظ زبانوں کی ترقی اور تعلیم کے لئے ہندوستان کے دستور ہند مرتب کئے جانے کے وقت آٹھویں شیڈیول میں بنگلہ، تامل، تیلگو، مراٹھی، کنڑ، پنجابی، سندھی، اردو، ملیالم، گجراتی اور دیگر زبانوں کو شامل کیا گیا۔ اس وقت شری کرپلانی نے چالاکی سے اس میں ایک قدیم زبان سنسکرت کو بھی جگہ دے دی۔ تیسری زبان کے طور پر انگریزی۔

لیکن دوسری زبان کے سلسلے میں یہ دیکھا گیا کہ ہندی والوں نے سنسکرت کو دوسری زبان میں منسوب کیا۔ اور ان کی اکثریت کی وجہ سے سنسکرت کے اساتذہ کا تقرر ہوگیا۔ اور اردو پڑھنے والے اتنے کم ہونے لگے کہ ان کے لئے اردو اساتذہ کی تقرری ریاستی حکومت کی مرضی پر ہی ممکن ہوگئی۔ اس طرح اردو والوں کو سنسکرت پڑھنا پڑا۔ اردو ایک اختیاری مضمون ہونے سے بھی خارج ہوگئی۔

ان سبھی زبانوں کے اپنے حلقے موجود تھے۔ مثلاً مغربی بنگال میں بنگلہ، تامل ناڈو میں تامل، مہاراشٹر میں مراٹھی، گجراتی، ملیالم کے اپنے علاقے۔

مگر اردو کا حلقہ کہاں ہے؟ یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ اردو غیر ملکی زبان ہے۔ اردو کا رسم الخط غیر ملکی ہے۔ اردو پاکستان کی زبان ے۔ اردو تقسیم کی زبان ہے۔ ان سب اعتراضات کا اردو والوں نے ثبوت کے ساتھ جواب دیا۔

غلام سرور نے اردو کے خلاف ان تمام اعتراضات کو رد کرتے ہوئے اپنی تحریر اور تقریر میں کہا۔

'اردو ترکی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی فوج (یعنی لشکر) کے ہیں۔ لال قلعہ کے اندر شہنشاہ کے سپاہی فارسی بولتے تھے اور باہر کے ہندوستانی مقامی بولیاں بولتے تھے۔ راجستھانی شورسینی، اپبھرنش، پراکرتوں اور مقامی بولیوں کے ساتھ فارسی نے جوڑ کھایا اور ایک نئی ملی جلی خالص ہندوستانی زبان اردو

وجود میں آئی۔ یہ مقامی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے پلی بڑھی اور پروان چڑھی اور سرتیج بہادر سپرو نے کہا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ جو ہمیں وراثت میں ملی ہے اور جو ہمارے لئے نا قابل تسلیم ہے۔

فرنگیوں نے بھی اردو اور ہندی کو الگ الگ ایک دوسرے کے مخالف زبان کی حیثیت دینے کی ناکام کوشش کی''۔

(حوالہ غلام سرور اسپیکر، مجلّہ یوم اردو۹۵صفحہ ۱۸)

ہندوستان کی آزادی بدقسمتی سے ''اردو'' کے لئے نامبارک ثابت ہوئی۔ اور اردو کے ساتھ ناانصافی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ گاندھی جی کی یہ تجویز کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو ہندی کی دیوناگری اور اردو رسم الخط (فارسی) دونوں میں لکھی جائے گی۔ یہ تجویز رد کر دی گئی۔ اور ہندوستان کی قومی زبان ہندی بہ خط دیوناگری باضابطہ طور پر تسلیم کیے جانے کا اعلان ہوگیا۔

اردو والوں نے بسر وچشم ہندی کو قومی زبان تسلیم کرلیا اور اسے پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ جبکہ جنوب کی ریاستوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔

حکومت نے ملک کی دیگر زبانوں کے مسئلے کے حل کے لیے ''سہ لسانی فارمولا'' کا راستہ نکالا۔ جس میں ہر علاقے کے لوگ اپنی زبان میں خصوصیت کے ساتھ طالب علموں کو تعلیم اور سہولت دے سکتے ہیں۔ اور اپنی تہذیب وثقافت کو بھی

۲۱/اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ریاستی سہ لسانی اردو کنونشن کا انعقاد لکھنؤ میں ہوا۔ لکھنؤ وہ شہر ہے جو اردو زبان وادب، تہذیب وثقافت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

ہم یہاں پر پنڈت آنند نارائن ملا کی وہ تقریر جو کئی صفحات میں ہے اس کی حتی الامکان تلخیص پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اس سہ لسانی اردو کنونشن کی صدارتی تقریر میں پڑھی تھی۔

انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ آخر ہم اتنے عرصہ تک خاموش رہے۔ بے چارے اردو والے یہ سوچ کر خاموش رہے کہ ملک ایک دور جنون سے گزر رہا ہے۔ اس وقت صبر کیا جائے جب ملک میں لسانی تعصب، تنگ نظری اور ذہنی توازن کی ہیجان انگیزی ذرا کم ہو جائے تو دستور ہند میں دیے ہوئے حقوق کے

مطالبے پیش کیئے جائیں گے۔ (ہندوستان کا دستور ۲۶/جنوری ۵۰ء میں ڈاکٹر امبیڈکر کی سربراہی میں پاس ہوا اور بلاشبہ یہ دنیا کا اعلی ترین آئین ہے۔ (لیکن....) کیا حق وانصاف کی بڑی حمایت کرنے کے باوجود اردو کو انصاف مل گیا؟

علاقائی اور دکن کی زبانوں کو پڑھانے سے یک جہتی کو تقویت مل گئی۔ اور اپنی ریاست (مثلاً یوپی، بہار وغیرہ) میں یکجہتی قائم کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اردو پڑھنے والوں کا مطالبہ دکنی زبانوں میں شامل کرنے سے رد نہ کیا جاسکا۔ تب سنسکرت کو سامنے لا کھڑا کر دیا گیا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ جو اردو پڑھنا چاہیں وہ اردو نہ پڑھ سکیں۔ اور سنسکرت کی آڑ لے کر یہ مقصد پورا کیا گیا۔

پنڈت آنند نارائن ملا کہتے ہیں کہ انہیں سنسکرت سے کوئی شکایت نہیں جو سنسکرت پڑھنا چاہتے ہیں شوق سے پڑھیں۔ لیکن ملک کی دوسری زندہ اور جدید زبانوں میں سنسکرت کا شمار کرنا اصولاً غلط تھا۔ اردو کے لیے یہ کسی قاتل سے کم نہیں۔

ڈائرکٹر تعلیمات نے جولائی ۱۹۶۳ء میں اسکول انسپکٹروں کو اسکولوں میں نافذ کرنے کے لئے ایک خط کے ذریعہ سہ لسانی فارمولا کی ہدایت بھیج دی۔

(۱) ہندی بحیثیت قومی زبان (سب کے لئے)

(۲) انگریزی یا کوئی دوسری جدید یورپی زبان۔

(۳) آئین ہند کی چودہ زبانوں میں اردو اور سنسکرت

(ملک کی کوئی جدید زبان)

آنند نارائن ملا جو خود اردو کے ایک مشہور شاعر اور انجمن ترقی اردو ہند کے صدر بھی تھے، انہیں اس بات سے تسکین ہوئی کہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کے چند ارشادات آتے رہے۔ اول یہ کہ اردو زبان میل جول کا عظیم ترین نمونہ ہے۔ دوم یہ کے اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اسے پردیسی یا اجنبی سمجھنا جہالت ہے۔

ریاستی حکومت کے ذمہ دار برابر یہ بات دہراتے رہتے ہیں کہ اردو الگ سے کوئی زبان نہیں بلکہ ہندی کی ایک شیلی ہے۔

کسی جمہوری حکومت کو یہ اختیار کس طرح حاصل ہے کہ ایک زبان کے اسٹائل کے لئے تو ہر سہولت مہیا کرے اور دوسری زبان کے دوسرے اسٹائل کے پڑھنے والوں کے لئے رکاوٹ پیدا کرے۔

اگر اردو ہندی سے الگ کوئی زبان نہیں، دراصل ایک ہی زبان ہے تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ملک کی قومی زبان ہندی کے ساتھ اردو بھی قومی زبان کا درجہ حاصل کر چکی۔لیکن جب اردو کے حق دینے کا مسئلہ اٹھتا ہے تو اردو ایک الگ زبان ہو جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو اور ہندی کی جڑیں ایک ہیں، صرف شیلی کا فرق ہے۔

یہ یقیناً درست نہیں۔ بقول آنند نارائن ملا گنگا، برہم پتر اور ستلج مانسرور جھیل سے نکلتی ہیں لیکن کوئی انہیں ایک دریا کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔آج اردو کا دنیا کی پانچ بڑی زبانوں میں شمار ہوتا ہے۔

آنند نرائن ملا نے فرمایا کہ اردو دوستوں کے لئے سخت آزمائش کا وقت ہے۔وزیر اعظم پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ اردو کو اس کے جائز حقوق ملنے چاہئیں، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ریاستی حکومت نے وزیر اعظم کی خواہش کا احترام نہ کیا۔اور اردو دشمنی پر عمل کرتی رہی۔

اب ذرا پنڈت آنند نارائن ملا کے ایک دلچسپ اظہار خیال کو سنیے۔مہابھارت میں یہ کہا گیا ہے کہ جب کوروں اور پانڈووں میں لڑائی کی ٹھن گئی تو دونوں فریق شری کرشن جی کے پاس ان کی مدد حاصل کرنے پہنچے۔شری کرشن جی نے ایک طرف خود کو دیکھا اور ایک طرف اپنی سینا کو۔سینا کوروؤں کے ساتھ آئی اور کرشن جی پانڈوؤں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ایسا لگتا ہے کہ وزیر اعظم اردو کے ساتھ ہیں لیکن ان کی سینا بغاوت پر آمادہ ہے اور اردو کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے........

لسانی سرے سے متعلق اگست ۱۹۶۱ء میں ریاست کے وزراء اعلیٰ کی نشست بلائی گئی۔کچھ مرکزی وزیر بھی شریک تھے۔کافی بحث و مباحثہ کے بعد طالب علموں کو تین زبانیں پڑھانے کا متفقہ فیصلہ ہوا۔قومی زبان ہندی اور انگریزی ہر طالب علم کے لیے ضروری قرار دی گئی۔اور باقی علاقائی زبانوں میں کسی ایک کا انتخاب طالب علم یا ان کے سرپرستوں پر چھوڑ دیا گیا۔اور اس کے نفاذ کا اختیار ڈائریکٹر تعلیمات اور اسکول کے مجلس منتظمہ پر چھوڑ دیا گیا۔

اور اردو والوں نے اس فارمولہ کا دل سے خیر مقدم کیا۔مگر ہندی علاقوں میں اردو کے ساتھ سنسکرت

بھی شامل کر دی گئی۔لیکن قابل افسوس لسانی حکومت لسانی تعصب کا شکار ہوگئی۔ہندی علاقوں میں اکثریت نے سنسکرت کا انتخاب کیا۔اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد کم تھی۔اس لئے ان کو پڑھانے کے لیے اردو اساتذہ کی تقرری اور مالی دشواری کا مسئلہ بنا کر انتظام نہ ہو سکا۔اس لئے اردو پڑھنے کے خواہش مند کو سنسکرت پڑھنا پڑتا ہے۔........

آنند نارائن ملا کے مطابق اکثریت کا یہ اصول مضحکہ خیز ہے۔کچھ لوگوں نے شوکت تھانوی کا ایک مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' پڑھا ہوگا۔مرحوم نے یہ لکھا تھا کہ ریل کے مسافر بیٹھتے چلے جاتے ہیں۔اور آخر میں یہ معلوم ہوا کہ کانپور جانے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور دوسری جگہ جانے والوں کی تعداد کم۔اس لئے گاڑی سیدھے کانپور جائے گی۔اور سب دوسری جگہ کے جانے والے مسافر بھی وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ڈائریکٹر تعلیمات نے ریل کو اسکولوں میں تبدیل کر دیا۔.......سنسکرت پر کوئی اعتراض نہیں قطعاً نہیں۔لیکن یہ اصولاً غلط ہے۔یہ زندہ اور جدید زبان اور عوامی زبان میں شمار نہیں کی جاتی۔پچھلے ہزار برس سے کوئی قابل ذکر کتاب نہیں لکھی گئی۔.......(حوالہ ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ جنوری ۱۹۶۸ء)

اس پس منظر میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یوپی میں اردو تحریک تاخیر سے شروع ہوئی۔مگر غلام سرور کی ہمت اور عزم دیکھئے کہ انہوں نے ۱۹۴۸ء سے ہی اقلیت اور اردو تحریک کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

جس وقت 'سنگم' کی اشاعت شروع ہوئی اس وقت پٹنہ (بہار) سے 'صدائے عام' اور 'ساتھی' روزنامہ مقبول اخبار شائع ہوتے تھے۔اور سنیچر کو سنگم ہفتہ وار شائع ہونے لگا۔(۱۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء سے....) اس دن صدائے عام اور ساتھی کی اشاعت بند رہتی تھی۔غلام سرور نے کہا کہ سنگم اخبار محض اردو اخبار میں اضافہ کے لئے نہیں ہے۔ان کے لفظوں میں سنگم محض اخبار نہیں ایک تحریک ہے۔

کچھ برسوں یعنی ۱۹۶۳ء سے سنگم روزنامہ بن کر شائع ہونے لگا۔شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''سنگم'' اخبار بھی بہار کا سب سے مقبول ترین اخبار ہو گیا۔غلام سرور کو بہت سارے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔مگر ان کے استقلال میں کمی نہ آئی اس کی کانگریس مخالف پالیسی سے اخبار سرکاری اشتہارات سے عام طور سے محروم ہی رہا۔جبکہ اخبار کے لیے سرکاری اشتہارات بڑی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔

غلام سرور دراصل کانگریس کے مخالف نہ تھے بلکہ اس پارٹی کی منافقانہ پالیسی کے خلاف تھے۔

۱۹۵۱ء کے بعد جب کل ہند انجمن ترقی اردو (پٹنہ) کی شاخ کا قیام بہار میں ہوا تو غلام سرور ہی اس کے پہلے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔اس وقت سے جنرل سیکرٹری،صدر یا رکن مجلس عاملہ میں جو بھی رہے ۲۵/برسوں تک وہی بہار کی اردو تحریک کی پورے جوش وخروش سے قیادت کرتے رہے۔متعدد اردو کنونشن کانفرنس منعقد ہوتی رہیں۔بہار میں اردو تحریک غلام سرور کی قیادت میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک چلتی رہی۔بہار ریاستی انجمن ترقی اردو،اردو تحریک کی واحد انجمن تھی۔(حوالہ اردو دوستوں سے دو دو باتیں۔تیسرا کتابچہ ۱۹۷۳ء)

کسی بھی تحریک کے لیے اخبار بھی ضروری ہے۔چنانچہ اردو تحریک کے لئے ''سنگم'' کے صفحات وقف تھے۔

وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر یہ بھی کہا کرتے تھے ''اردو ہماری زندگی ہے اور اردو کی موت ہماری موت ہے۔''

یہاں پر ہم اس اہم کنونشن کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۹۶۵ء میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت کے لیے انہوں نے کشن پرشاد کول سے گزارش کی تھی۔اس وقت غلام سرور حج کے لئے روانہ ہو چکے تھے(۱۹۶۵ء)۔اس تقریر کی اہمیت کے پیش نظر اس صدارتی تقریر کے اہم حصے پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

ہماری زبان اس وقت نہایت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ہندی اور اردو دونوں ایک ماں کی سگی بہنیں ہیں۔لیکن ہمارے فرقہ وارانہ تعصب اور جوش نے ہندی اور اردو یا ہندوستانی میں غیریت کا سوبھاؤ پیدا کر دیا ہے۔

چار پانچ ہزار بیتے کہ پراچین آریہ ورت کے آریوں کی بھاشا سنسکرت تھی۔یہی بھاشا دیس میں بولی جاتی اور لکھی جاتی تھی۔بدھ مت کے پرچار کے جگ میں سنسکرت کی جگہ ان پراکرتوں نے لے لی جو عام لوگوں میں بولی جاتی تھی آٹھویں صدی عیسوی میں پراکرتیں علم وادب کے خزانوں سے خالی ہو کر جنتا کی بگڑی ہوئی بولیاں ہوگئیں۔اور انہیں اب بھرنش کہا گیا۔

اب بھرنش سے موجودہ ہندوستان کی تمام زبانیں نکلی ہیں۔جو بنگالی،مراٹھی،گجراتی،پنجابی،

ہندوستانی یا ہندی کے ناموں سے مشہور ہیں۔

بہار میں میتھلی،اودھی،بھوجپوری رائج تھیں،دلی اور میرٹھ کے اردگرد کھڑی بولی،آگرہ اور متھرا کے آس پاس برج بھاشا بولی جاتی تھی۔

جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور یہاں آکر بس گئے تو ان کو پنجابی اور کھڑی بولی سے سابقہ پڑا۔انہیں کے دور میں کھڑی بولی میں فارسی عربی اور ترکی کے لفظ داخل ہونے لگے۔اور ایک کھچڑی زبان پیدا ہوگئی جس نے ہندی ہندوستانی یا اردو کا نام پایا۔یہی پردیس جا کر دکن میں ابھری۔

مظہر جان جاناں نے دلی میں اردو کو کنگھی چوٹی سے سنوارا اور ناسخ نے لکھنؤ میں اس کا سولہ سنگھار کر کے دلہن بنایا۔یہ ریختہ اور اردو کے ناموں سے پکاری گئی۔اور(دور مغلیہ میں) اردو معلٰی کا خطاب پایا مختصراً کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی یا اردو نے اسی دیس میں جنم لیا۔یہی پالی پوسی گئی اور یہی پھلی پھولی۔کم سے کم شمالی ہند میں کروڑوں کی تعداد میں بولی جاتی ہے۔(گرچہ) اتر پردیش اردو دشمنی کا مرکز بنا رہا ہے اور تعصب ابھی تک کام کر رہا ہے۔اب سوچنے کی بات ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔

اگر حکومت کی بے اعتنائی اور تعصب بھی ہو تو اس کے بولنے والے اور چاہنے والوں میں ہمت اور حوصلہ ہے تو حکومت بھی نہیں مٹا سکتی۔دوسری بات ذہن نشین کر لیں کہ جیتی جاگتی زبانیں اپنے دور کے لحاظ سے چولا بدلتی رہتی تھیں۔

یہاں انگریزی راج قائم ہوا تو نئی روشنی پھیلنے لگی۔سرسید احمد خان،حالی،شبلی،رتن ناتھ سرشار نے اپنے اسلوب تحریر سے اس کا چولا بدلا۔جو ورثہ (میرؔ) غالب ذوق،آتش،ناسخ،سرشار اور چکبست جو چھوڑ گئے،وہ کلیجے سے لگائے رکھنے کے قابل ہے۔پھر حالی،اکبر،اقبال،حسرت اور چکبست نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔انیسوی صدی تک ہماری زبان اور ادب شرفا تک محدود رہی۔پست طبقے نے بے توجہی برتی۔بیسویں صدی میں پریم چند نے اردو کو متوسط طبقہ اور نچلے طبقوں کے مزدوروں اور کسانوں کے دروازے تک (اپنے ناولوں اور افسانوں سے) پہنچا دیا۔اب جمہوریت اور سائنس کے دور میں ہم غلام نہیں آقا ہیں۔

ہم نے اتر پردیش میں دستخطی تحریک کامیابی سے چلائی۔اور بیس لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ

کی خدمت میں اردو کے ذریعہ ابتدائی تعلیم عصر نو پھر سے مناسب طور سے شروع کرائیں تو ہوا کا رخ بدل جائے گا عرضداشت پیش کر دی۔ بہار میں بھی مہم چلی اور دس لاکھ دستخط (بذریعہ غلام سرور) مہیا کئے گئے۔انہوں نے یعنی (ڈاکٹر ذاکر حسین اور غلام سرور نے) ہمارے حوصلے بڑھا دیئے۔اردو کے ذریعہ ابتدائی تعلیم ازسرنو مناسب طور سے شروع کرائیں تو ہوا کا رخ بدل جائے گا۔

سائنس اور دور جمہوریہ میں ہندوراشٹر یا شرعی حکومت کے سپنے دیکھنا عقل کی بات نہیں۔ چودہ سو برس کے تمدن اور کلچر کو جو گزر کر ختم ہو گیا، آج جلا کر روشن نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارا تمدن اور کلچر مشترک ہوگا۔ یک رنگی نہیں بلکہ دو رنگی یا سہہ رنگی ہوگی۔اس گنگا جمنی تہذیب کا تانا بانا پراچین آریائی ہوگا۔نقش ونگار اسلامی دور کے ہوں گے اور رنگ گہرا مغربی جس میں نئی روشنی کی کرنوں کی تارے جھلکتے رہیں گے۔

کشن پرشاد کول اپنی تاریخی صدارتی تقریر ختم کر کے تالیوں کی گونج میں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔غلام سرور جو اس وقت کنونشن کے روح رواں تھے، حج کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔اور بمبئی سے ہی اپنی تجویز بھیجی کہ آئندہ ہم اردو کو الیکشن ایشو بھی بنائیں گے اگر ہمارا مطالبہ اردو کے لئے منظور نہیں کیا گیا۔'سنگم' میں اس کی پوری تفصیل شائع ہو چکی ہے۔

انہی دنوں کی بات ہے ۱۹۵۴ء-۵۵ء میں بہار اردو اسٹوڈنٹس کنونشن کی تحریک ہم نے بھی شروع کی۔اپنے مسائل اور اردو کے لیے یہ کنونشن کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ ہم برابر غلام سرور کی سرپرستی میں رہے اور سنگم اخبار میں ہماری جدوجہد کی خبریں شائع ہوتی رہیں۔اسی موقع پر ہم نے نوجوان طالب علم عبدالمغنی کا تعارف غلام سرور سے کرایا جو مدرسہ شمس الہدیٰ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے پٹنہ کالج میں داخلہ لے چکے تھے۔آگے چل کر عبدالمغنی اردو تحریک میں اپنی صلاحیت، تقریر اور تحریر کی وجہ سے دوسرے نمبر پر آ گئے۔نوجوان طلبہ وطالبات کی تحریک پورے بہار میں مقبول ہوگئی۔ ہماری تحریک کے زیادہ طلباء اپنی ایم.اے. کی تعلیم ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء تک تعلیم مکمل کر چکے تھے اور کچھ ملازمت میں بھی آ گئے۔

۱۹۵۱ء کے بعد سے ہی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، غلام سرور کی قیادت میں پابندی کے ساتھ روبہ عمل رہی۔

اردو کے خلاف جو اعتراضات کیے گئے، غلام سرور ان کا مدلل جواب دیتے رہے۔ بلکہ دوسرے انصاف پسند اور ہندو بھائیوں کی کئی اہم شخصیتوں نے بھی مکمل ثبوت کے ساتھ اردو مخالفین کے اعتراضات کے جواب اس طرح دیے کہ اس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

غلام سرور ۱۹۵۲ء سے ہی اردو کی حمایت میں دستخطی مہم شروع کر چکے تھے اور ۱۹۵۴ء تک تقریباً اپنی محنت اور عزم سے تقریباً دس لاکھ دستخط حاصل کر چکے تھے۔ یہ اعتراض بھی اٹھایا گیا کہ بنگلہ، تمل، تلگو، گجراتی، ملیالم، کنڑ اور دیگر زبانوں کے علاقے تو موجود ہیں۔ان کو یہ نظر نہیں آیا کہ اردو تو ہندوستان کی Lingua Frank ہے۔ یہ شمال اور جنوب مشرق ومغرب گویا پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

غلام سرور کے لفظوں میں اچھا بابا مان لیا اردو کا علاقہ کہاں ہے۔

خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

لو ہم علاقہ بتاتے ہیں۔اتر پردیش اور بہار۔اردو آبادی نے دستخطی مہم شروع کی۔اتر پردیش میں ۲۲/لاکھ دستخط جمع ہوئے اور بہار میں 10 لاکھ پندرہ ہزار، یوپی میں اردو آبادی کا وفد ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں ۲۲/لاکھ دستخطوں کے ساتھ صدر جمہوریہ (ڈاکٹر راجندر پرشاد) سے ملا۔اور بہار میں اردو آبادی کا وفد لیڈی انیس امام ایم.ایل.سی. (بشمول غلام سرور) کی سربراہی میں ملا۔(اور ان کی ہدایت کے مطابق دستخطی کاپیاں جمع کر دیں۔(بہار میں میمورنڈم جمع کرنے کی تاریخ ۱۹۵۶ء)

اس واقعہ کو چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔یوپی میں حالات جیوں کے تیوں رہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یوپی میں اردو تحریک کی قیادت Urban Elite کے ہاتھوں رہی۔جبکہ بہار میں عام لوگوں کے ہاتھ رہی۔سرفروشوں کے دل میں رہی۔ یہ تحریک کھیتوں اور کھلیانوں۔اور گاؤں گلیاروں تک پہنچ گئی۔(بحوالہ غلام سرور، ۷۰ویں سالگرہ کے مجلّہ میں صفحہ ۱۸/، ۱۰ جنوری ۹۵ء)

بقول بیتاب صدیقی جنرل سیکرٹری انجمن، جن کا اوڑھنا بچھونا اردو رہا اور مقامی رام موہن رائے سیمنری پٹنہ میں اردو کے استاد تھے، کہتے ہیں کہ یوپی میں تو اردو پر رولر چلتا رہا مگر بہار میں اس کی حالت اس سے بہتر تھی۔

دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق یوپی اور بہار میں اردو کو علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کا مطالبہ پیش ہو چکا تھا۔غلام سرور نے اردو کے لیے سات مخصوص مقاصد کے لئے ریاستی حکومت کو قانونی حق دینے کا جو مطالبہ کیا تھا وہ درج ذیل ہے۔

(۱) جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کو ابتدائی (پرائمری) سطح پر اردو کے ذریعہ لازمی طور پر تعلیم دی جائے۔

(۲) ثانوی اسکولوں میں (اردو کے بچوں کی تعداد کم بھی ہو) خاص کر سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کا مناسب انتظام ہو۔

(۳) اردو کالجوں اور یونیورسٹی کے مدارج تک اردو اساتذہ کی تقرری کی جائے تا کہ اردو پڑھنے والے طالب علموں کو سہولت ہو اور وہ اس سے محروم نہ کیے جائیں۔

(۴) ریاست کی عدالتوں اور دیگر سرکاری محکموں، سرکاری دفتروں میں اردو کی تختیاں لگانے کی اجازت دی جائے۔

(۵) تمام سرکاری اعلانات، فہرست رائے دہندگان (الیکٹرول رول)، راشن کارڈ، پریس نوٹ، گزٹ اردو میں بھی شائع کیے جائیں جو عوام سے متعلق ہوں۔

(۶) ایسے عوامی ادارے جو سہولت پہنچانے والے ہوں وہاں اردو والوں کو بھی نمائندگی دی جائے۔اردو درخواستوں کو منظور کیا جائے۔اسمبلی کانسل کی رپورٹنگ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی کی جائے۔

(۷) تمام سرکاری سائن بورڈ، نشانات جن کا مقصد عوام کو سہولت پہنچانا ہے۔اس کو ہندی کے ساتھ اردو میں بھی تحریر ہو۔

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے صبر آزما گھڑیاں گزرتی رہیں۔۱۹۶۷ء میں انجمن اسلامیہ ہال کے ایک نمائندہ اجلاس میں بہار میں اردو کو الیکشن ایشو بنایا گیا۔اس وقت پٹنہ بہار کے وزیر اعلی شری کے۔بی۔سہائے کانگریس کے وزیر اعلی تھے۔انہوں نے پٹنہ اور ہزاری باغ سے انتخاب لڑنے کا ارادہ کرلیا تھا۔غلام سرور جو شروع سے ہی کانگریس کی مخالفت میں اپنی پوری ثابت قدمی سے متحرک رہے۔کانگریس کی مخالف جماعت سے مشہور رہنما شری مہامایہ پرشاد کے۔بی۔سہائے سے مقابلہ کے لئے میدان

میں اترے۔اس وقت غلام سرور مہامایا پرشاد کی حمایت میں اتر گئے۔گاندھی میدان میں انہوں نے کے۔بی۔سہائے کے خلاف ایسی شستہ بھاشا میں جوشیلی تقریر کی کہ لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔یہاں تک کہ میں نے ایک گھاس گڑھوا کو کہتے سنا کہ ''آج کیا جوردار بھاشن دیا ہے سرور جی نے'' غلام سرور کی اس تقریر کی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی۔دوسری پارٹیوں کے کانگریس مخالف امیدواروں میں بہتوں نے ان کے حلقۂ انتخاب میں ایک تقریر کرنے کی گزارش کی۔اور آخر ان میں سے کئی امیدواروں کے حلقہ انتخاب میں جانا پڑا۔

انتخاب کا نتیجہ برآمد ہوا تو کے۔بی۔سہائے پٹنہ اور ہزاری باغ دونوں جگہوں سے ہار گئے۔کانگریس اسمبلی میں اقلیت میں آگئی۔متحدہ محاذ کی حکومت بن گئی جس کے وزیر اعلیٰ شری مہامایہ پرشاد ہوئے جو نوجوانوں کو ''میرے جگر کے ٹکڑے'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ ماحول کچھ کانگریس کے خلاف ایسا بن گیا تھا کہ کمیونسٹ اور جن سنگھ (جو ۷۷ء کے بعد بی جے پی کے نام سے مشہور ہوئی) پارٹیاں مشترکہ طور پر وزارت میں داخل ہوئیں۔

شری مہامایہ پرشاد نے غلام سرور کو وزارت میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔انہوں نے وزارت میں شمولیت سے انکار کردیا۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا دفتر میرے کرائے کے مکان کے ایک حصہ ''بیت الوارث'' نیا ٹولہ (پٹنہ) غلام سرور کی ایما (ہدایت) پر منتقل ہو گیا تھا جو ۱۹۷۱ء تا ۳/۷/۱۹۷۴ء تک بہترین انتظامی امور کے ساتھ قائم رہا۔مولانا بیتاب صدیقی کی علالت کی وجہ سے راقم الحروف پر ہی قائم مقام جنرل سیکریٹری کی ساری ذمہ داریاں تھیں۔اس وقت اس کی کارگزاریوں کی دھوم سارے ہندوستان میں ہو چکی تھی۔سالار قافلہ غلام سرور اور دوسرے نمبر پر پروفیسر عبدالمغنی دونوں ہی اپنی تحریر و تقریر میں اور دانشوری میں بے مثال تھے۔اور شاہ مشتاق کی غلام سرور کے لئے ایک سرپرست جیسی حیثیت بھی برقرار تھی۔اسی زمانے میں پروفیسر عبدالمغنی کے والد محترم پر اورنگ آباد وقف کی نہ معلوم کس طرح انکوائری شروع کرادی گئی۔اس کے لیے غلام سرور قطعی طور سے ذمہ دار نہ تھے۔یہ بات انہوں نے مجھ سے بھی کہی تھی۔اس کی وجہ سے پروفیسر عبدالمغنی سخت ناراض ہوئے۔ہارون رشید اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبدالمغنی کو لے اڑے

اورعبدالمغنی کومکمل طور سے کانگریس میں پہنچا دیا۔

۱۹۷۲ء میں کانگریس پھر اقتدار میں واپس آ گئی ۔عبدالغفور جولائی ۷۳ءتا اپریل ۷۵ءتک (بذریعہ اندرا گاندھی) ریاست کے وزیراعلیٰ مقرر ہوئے ۔ جے ۔ پی. کی تحریک اندرا گاندھی کے خلاف شروع ہو چکی تھی ۔ بقول غلام سرور’’بہار ریاستی انجمن ترقی اردو ایک مؤثر طاقت بن چکی تھی۔جس کی وجہ سے دہلی تک کے ایوانوں میں اس کو اہمیت دی جانے لگی ۔(حوالہ اداریہ سنگم ۳رمئی ۷۵ء)

معروف صحافی ریحان غنی کے لفظوں میں’’یہ وہ دور ہے جب اردو والوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو توڑنے کی سازش شروع ہوئی۔

(حوالہ فردنامہ عبدالغنی صفحہ ۲۰۱۹/۳۵ء)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا انتخاب ۱۹۷۵ء ہنگامہ کی نذر ہو گیا۔غلام سرور اور عبدالمغنی دونوں انجمن کے لیے صدر کے امیدوار تھے ۔انجمن دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ۔ایک کا راستہ کانگریس کے اقتدار کے حمام میں جاتا تھا اور ، بقول غلام سرور، دوسرے کا کانگریس مخالف حمام میں ۔’’ذاتی فائدہ تو شاید ہو جائے لیکن تمہاری مادری زبان کا گلا گھٹ جائے گا۔اگر ہوش سے کام لے کر پرچم اردو بلند کر کے صحیح راہ اختیار کی تو پھر لیلیٰ تمہاری منتظر ہے۔‘‘(غلام سرور، اداریہ سنگم، ۷۵)

شمالی بہار کی ایک اہم شخصیت ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی کی تھی ۔وہ بھی اردو زبان کے ایک مجنوں تھے۔ مظفر پور میں ۱۹۶۰ء میں ان کی صدارت میں بہار اسٹیٹ اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔۳/۴ر دسمبر کی یہ کانفرنس انتہائی شاندار طور سے کامیاب ہوئی ۔ پٹنہ سے سید جعفر امام ،محمد ایوب ایڈوکیٹ ،غلام سرور،مولانا بیتاب صدیقی نے شرکت کی اور کام کر کے عظیم الشان اور شاندار بنا دیا۔

ڈاکٹر مغفور احمد اعجازی کی قیادت میں مظفر پور کی شاندار کانفرنس کی کامیابی پر غلام سرور نے اعتراف کرتے ہوئے اخبار سنگم میں’’شاباش حامیان اردو‘‘ کے عنوان سے حسب ذیل تحریر درج کی۔

۳/۴ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو مظفر پور میں بہار ریاستی اردو کانفرنس منعقد ہوئی ۔۳ر دسمبر کو دن میں مظفر پور ریلوے اسٹیشن سے تاریخی جلوس نکلا۔جس میں تقریباً دس ہزار افراد شریک تھے ۔بچوں کی تعداد بہت کم ،بوڑھوں کی بہت زیادہ اور نوجوانوں کی سب سے زیادہ تھی ۔کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے شرکاء ممبران

پارلیمنٹ ،اسمبلی و کانسل، سوشلسٹ ، فارورڈ بلاک ،سوتنتر پارٹی کے نمائندہ ،وکلاء ، معالجین ، مدرس ، تجار، ادباء اور شعراء ، ہندو بھی ،مسلمان بھی اور سکھ بھی ،عورتیں بھی ،شیخ بھی اور برہمن بھی موجود تھے ۔آزادی ہندوستان کے بعد یہ سب سے بڑی اور ہر لحاظ سے کامیاب ترین کانفرنس تھی ۔اس حقیقت کا اعتراف ہر سنجیدہ اور ایماندار حلقہ نے کیا۔

(حوالہ سنگم ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۰)

جناب غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی ،مولانا بیتاب صدیقی ،سید شاہ مشتاق احمد وغیرہ نے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو میمورنڈم پیش کیا جس میں اردو کو علاقائی زبان بنانے کا مطالبہ تھا ۔اس جلوس میں عبدالقیوم لال گنجوی ،جمیل احمد ایڈوکیٹ ،منصور اصغر اعجازی بھی تھے ۔اس میں حسب ذیل نعرے لگائے گئے ۔اردو کا حق دو، اردو ہندی بہنیں ہیں ۔ بہنوں میں سنگھرش نہیں۔

۱۹۷۷ء میں وزیراعظم ہند محترمہ گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی ۔ جے پرکاش کی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی ۔ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد ملک میں انتخاب ہوا تو اندرا گاندھی کی شکست ہو گئی ۔اور مرکز میں غیر کانگریسی سرکار کی مخلوط حکومت تشکیل پائی ۔جس کے پہلے وزیراعظم مرار جی ڈیسائی ہوئے ۔

مرکزی انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) نے اردو گھر دہلی میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا۔اس جلسے میں وزیراعظم ڈیسائی نے یہ کہا،’’اردو تقسیم کی زبان ہے ۔‘‘ سامعین ان کا یہ جملہ سن کر دنگ رہ گئے ۔میری توقع کے خلاف’’اخبار سنگم‘‘ میں اس جملہ کی تردید میں کوئی بیان یا کوئی اداریہ نہ آیا۔لیکن کچھ عرصے کے بعد بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ غلام سرور کی قیادت میں گاندھی میدان کے نزدیک کرشن میموریل ہال میں منعقد ہوا جو سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔شکیل احمد خان ایڈوکیٹ نظامت کر رہے تھے ۔اردو کی عظمت اور گنگا جمنی تہذیب کا ذکر ہوا ۔اس وقت غلام سرور ریاستی سرکار کی غیر کانگریسی کی حکومت میں کرپوری ٹھاکر وزیراعلیٰ کی کابینہ میں وزیر ثانوی تعلیم بن چکے تھے۔

کرپوری ٹھاکر کی غیر کانگریسی سرکاری حکومت کے بعد اور مرکز میں اندرا گاندھی کی واپسی کے بعد ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا بہار کے وزیراعلیٰ بنائے گئے ۔انہوں نے اپنی پہلی کابینہ کی نشست میں

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کیا۔انہوں نے فوراً اپنی کابینہ کے ریاستی وزیرمملکت شمائل نبی سے اردو مطالبے کی تجویز طلب کی۔ حیران وپریشان شمائل نبی نے جلدی سے ریاض عظیم آبادی کو بلوایا۔اور اپنی طرف سے ایک بف شیٹ لکھنے کو کہا۔صحافی ریاض عظیم آبادی نے دعویٰ کیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لئے جو سات مقاصد ہیں انہیں زبانی یاد ہے۔انہوں نے بف شیٹ لکھ کر شمائل نبی کے حوالے کر دیا۔شمائل نبی نے جلدی میں گہرائی سے نظر ثانی بھی نہیں کی اور ڈاکٹر مشرا کو بف شیٹ پیش کر دیا۔

غرض ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزیراعلیٰ بہار نے راج بھاشا قانون میں ترمیم کر کے دستور کی دفعہ 345 کے مطابق ترمیم کر کے (۱۹/جنوری ۱۹۸۱ء) ۱۷/اپریل ۱۹۸۱ء میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے لیے ۱۵ اضلاع بہار میں نوٹیفکیشن جاری کر دیا (652 نمبر)۔اس کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۸۹ء میں بہار کے وزیراعلیٰ شری ستیندر نارائن سنہا ہوئے تو انہوں نے ۲۹/جون ۱۹۸۹ء میں اردو کو ۱۱/اضلاع میں اور ۱۶/اگست ۱۹۸۹ء میں باقی ۱۳/اضلاع میں اردو کو دوسری زبان بنانے کی سہولتوں کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔

یہ تینوں نوٹیفکیشن درج ذیل ہیں۔

اردو ملازمین کو سرکاری دفتروں میں مختلف کاموں میں اردو کے استعمال کے متعلق نوٹیفکیشن:

بہار گزٹ ململہ 15 اگست 1981 (صفحہ 230)

نمبر 3/ 652-77/618-3-/

نوٹی فکیشن ۱۷/اپریل ۱۹۸۱ء

بہار راج بھاشا (ترمیم) ایکٹ 2،1980) نوٹیفکیشن کی دفع 3 کے ذریعہ سونپے گئے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے گورنر بہار ہدایت دیتے ہیں کہ نوٹیفکیشن جاری ہونے کی تاریخ سے ریاست کے پندرہ ضلعوں میں اردو دانوں کے مفاد میں راج بھاشا ہندی کے علاوہ اردو کا استعمال دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے درج ذیل سرکاری کاموں کے لیے کیا جائے گا۔

۱۵/اضلاع - پورنیہ، کٹیار، دربھنگہ، سیتامڑھی، بھاگلپور، مدھوبنی، بیگوسرائے، مظفرپور، سہرسہ، پوربی چمپارن، نوادہ، دھنباد، مغربی چمپارن، گیا اور سمستی پور۔

ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے بعد جب شری ستیندر نرائن سنہار بہار کے وزیراعلیٰ ہوئے تو انہوں نے بہار

کے اردو طبقہ میں اپنی مقبولیت بڑھانے کے لئے دوسرے مرحلے میں بہار کے ۱۱/اضلاع میں اردو کو (محکمہ راج بھاشا نوٹیفکیشن 7/85 ۲۹/جون 1989) تیسرے مرحلے میں محکمہ راج بھاشا بہار سرکار 3-16 85/ 7/اگست 1989 تیرہ اضلاع میں اردو کو بہار میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا۔

اردو کو بہار میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا پہلا اعلانیہ اس طرح درج ہے:

(۱) اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کا موصول کیا جانا اور اردو میں ہی ان کا جواب دینا۔

(۲) اردو میں تحریر دستاویزوں کا رجسٹری آفس کے ذریعہ منظور کیا جانا۔

(۳) اہم سرکاری قوانین، ضابطوں اور نوٹی فکیشن کی اردو میں بھی اشاعت۔

(۴) عوامی اہمیت کے حامل سرکاری حکم ناموں، سرکلروں کو اردو میں جاری کرنا۔

(۵) اہم سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اشاعت۔

(۶) ضلع گزٹ کے اردو ترجمہ کی اشاعت۔

(۷) اہم سائن بورڈوں کی اردو میں نمائش۔

واضح رہے کہ اس میں دو اہم خامیوں کی نشاندہی ضروری ہے اردو کے ساتھ اس کا رسم الخط شامل نہیں ہے۔اور دوسری بنیادی غلطی یہ ہے کہ اردو تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔اردو پڑھنے والوں کے لئے پرائمری سطح ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا انتظام اور پھر ثانوی تا یونیورسٹی تک اردو تعلیم کا نظم اور اردو اساتذہ کی تقرری۔

اس نوٹیفکیشن اول کی اشاعت کے وقت ہی راقم الحروف نے غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کو اس کی اس شدید خامی اور بنیادی طور پر سات مقاصد سے اردو تعلیم کا حذف کر دینا اور کسی طرح کا ذکر نہ کرنا سے آگاہ کر دیا تھا۔مگر اس کے بعد بھی اصلاح نہ کرنا کیا معنی؟ اس کے علاوہ حکومت سے جو اعلانیہ شائع ہوا، کیا اس پر پوری ایمانداری سے عمل ہو سکا؟

۱۹۷۵ء میں انجمن کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔اس سے ہم واقف تھے۔عبدالغفور نے بہار میں اپنی وزارت اعلیٰ کے مختصر دور میں اس بات کی کوشش کی کہ دونوں گروپ میں ایک سمجھوتا ہو جائے۔لیکن ان کے سمجھوتہ کی فہرست (عہدیداران) کو قبول نہ ہوئی۔پھر ان کی نگرانی میں نئی ممبر سازی شروع کی گئی۔ جس

کی رقم بھی انہیں کے پاس جمع کی گئی۔مقدمے بھی ہوئے ،کسی انتخاب کی تاریخ پر روک لگائی گئی۔جب مقدمات ختم ہوگئے تو انجمن ترقی اردو کا نیا انتخاب رام موہن رائے سیمنری میں منعقد ہوا جس میں عبد المغنی کو صدر منتخب کرلیا گیا۔غلام سرور گروپ نے اس کا بائیکاٹ کیا۔عبدالغفور وزیراعلی بہار نے ممبر سازی کی رقم (۴۰؍ہزار) عبدالمغنی کے حوالے کردی۔

پروفیسر عبدالمغنی کی انجمن کے ساتھ غلام سرور کی انجمن چلتی رہی۔۱۹۸۰ء میں جب ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا تو اس کے لئے ۵۰؍ہزار سالانہ رقم بھی گرانٹ کرنے کا فیصلہ صادر کردیا۔جو آگے چل کر ۸؍لاکھ ہوگئی۔اوراب شاید (۱۸؍لاکھ) ہے۔ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے بعد پھر بہار میں غیر کانگریسی سرکار جس کی قیادت بحیثیت وزیراعلی کرپوری ٹھاکر کررہے تھے انہوں نے غلام سرور کو اپنی کابینہ میں وزیر تعلیم (ثانوی) بنایا۔کرپوری ٹھاکر کے دور میں غلام سرور نے اس بات کی کوشش کی کہ انجمن ترقی اردو بہار (عبدالمغنی گروپ) کی رقم ان کی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو دی جائے۔مگر انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی کے جنرل سکریٹری خلیق انجم عبدالمغنی کی انجمن کو ہی تسلیم کرنے کی اطلاع دے چکے تھے۔چنانچہ کرپوری ٹھاکر نے ایک طرف غلام سرور کو وزارت دی اور دوسری طرف عبدالمغنی کی صدارت انجمن قبول کرتے ہوئے عبدالمغنی کی تشکیل شدہ انجمن کی گرانٹ جاری رکھی۔غلام سرور کابینہ کے وزیر ہونے کی وجہ سے اپنی انجمن سے ہٹ چکے تھے اور یہ انجمن خستہ حالی کا شکار ہورہی تھی۔اوران کی غیر حاضری کی وجہ سے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں سرد ہورہی تھیں۔

غلام سرور اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ کانگریس سہ لسانی فارمولا میں ہندی بحیثیت قومی زبان اور تیسری زبان کے طور پر انگریزی کو لازمی طور پر پڑھنے کا اعلان کر چکی تھی۔کرپوری ٹھاکر ہندی کے زبردست حامی تھے مگر وہ انگریزی کو لازمی طور پر رکھنے کے حامی نہ تھے۔اردو کے لیے ان کا کیا موقف تھا۔میں اس سے صحیح طور پر واقف نہیں۔انہوں نے اپنے دور میں وزیراعلیٰ کے تعاون سے ''اقلیتی کمیشن کا قیام کیا اور مدرسہ ایگزامینیشن بورڈ کی تشکیل کی۔

ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزیراعلیٰ بہار نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بناتے ہوئے اردو کے ۵ مطالبات کو تسلیم کرلیا لیکن ۲(دو) اہم مطالبات یعنی ابتدائی تا یونیورسٹی سطح تک ''اردو تعلیم'' کا نظم و نسق

سے متعلق مطالبہ نظر انداز کردیا۔حالانکہ کے اردو کا مستقبل پرائمری،ثانوی اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک اردو تعلیم سے ہی وابستہ تھا۔اگر یہ سہولت فراہم نہ ہوئی تو ''نئی نسل'' جو اردو پڑھنا چاہتی ہے اس سے نابلد اور ناواقف ہوجائے گی۔اپنی تہذیب،معاشرت،ثقافت اور اپنی ادبی اور دینی تاریخ سے کٹ کر گونگی ہو جائے گی۔مگر ان کے سرپرست ہی غافل ہوکر اسے اپنے گھروں سے نکالنے لگے تو پھر انجام سوچئے۔

بہرحال اردو والوں نے پھر بھی ڈاکٹر مشرا کی بہت پذیرائی کی کیونکہ انہوں نے اردو مترجم،نائب مترجم،ٹائپسٹ کی تقرری میں شاندار پیش رفت دکھائی۔اور ہزاروں لوگوں کے گھروں میں چولھے کی لو بڑھادی۔

خواہ مخواہ ایک سوال اٹھایا گیا محسن اردو کون ہے؟ میرے خیال میں یہ بحث ہی بیکار اور بے معنی تھی۔ میں یہاں پر پروفیسر عبدالمغنی کی ایک تحریر درج کرتا ہوں۔

''اردو کو دوسرکاری زبان ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے نہیں بنایا بلکہ آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی کے فرمان سے دوسری سرکاری زبان بنی۔ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا درجہ دینے سے ہچکچارہے تھے۔اندرا گاندھی کا فرمان آیا کہ اردو والوں اور انجمن کا مطالبہ پورا کرو تو ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کو یہ حکم ماننا پڑا۔'' (ریحان غنی کے انٹرویو کے حوالہ سے فردنامہ عبدالمغنی صفحہ ۸۶)

یہاں پر مجھے دو اشعار یاد آ گئے۔وہ اس طرح ہیں۔

(۱) جب بھی دنیا میں کوئی فتنہ کھڑا ہوتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں قربت میری

(۲) تجاہل،تغافل،تبسم،تکلم
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہوکر

ہم نے غلام سرور کو یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا بھی ہے۔اور یہ اشعار ان کی تحریروں میں کہیں شامل بھی ہیں۔

غلام سرور نے اپنے ایک کتابچہ ''اردو تحریک کے پچاس سال-۱۹۸۸ء) میں مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری تقریر کا ذکر کیا ہے جو ۱۵؍فروری ۱۹۵۸ء میں جامع مسجد کے سامنے انہوں نے کی تھی۔

''جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے آج آپ نے یہ مجلس اس لئے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی زندگی میں اردو کی جو جگہ ہے اس کا اعتراف کیا جائے۔ آپ اردو کے موافق ہیں جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت سندر لال نے کہا ہے کہ یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ہندی کا مخالف ہو۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے۔ آج سے ۳۰ر-۴۰رسال پہلے زبان کے بارے میں آپ کو یاد ہوگا ایک بہت بڑا جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو.......... ہم ہر وقت اسی نگاہ سے دیکھتے تھے.................. جب ملک آزاد ہوا اور اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب ہو گیا اور اردو کی ایک رقیب کی حیثیت ختم ہوگئی۔

اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہے کہ اسے جانے۔ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔

ابوالکلام آزاد کی تقریر کا حوالہ :

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی کیا حیثیت ہے؟ اب اردو کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے۔ بہت سے لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں۔ حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے.......... ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے۔

لیکن اسی کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے اسے ملنی چاہئے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقے میں اردو بولی جاتی ہے۔ اور سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ بولی جاتی ہے۔ یوپی، بہار، دلی، پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت نہیں۔

''مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لئے بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ملے گی اور جب وزیر اعظم ہندوستان نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔''

(تقریر کا حوالہ۔ فروغ اردو، لکھنؤ، اردو مہم نمبر)

بہار سے اس کانفرنس میں ۵۷رافراد شریک ہوئے جس کی قیادت انجمن کے صدر محمد ایوب

ایڈووکیٹ نے کی۔ اور انجمن کے جنرل سکریٹری غلام سرور بھی شریک تھے۔ غلام سرور کے الفاظ میں ''مولانا نے اس تاریخی تقریر میں برملا یہ اعلان کیا کہ آزاد ہندوستان میں ہندی کو جو ملنا تھا اسے مل چکا مگر اردو کو اس کی قرار واقعی جگہ ملنا ابھی باقی ہے۔''

۱۹۶۰ء میں بمقام مظفر پور اردو کانفرنس (۳، ۴ر دسمبر) بذریعہ مغفور احمد اعجازی کی سربراہی میں شاندار کامیابی کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب مدھوبنی (شمالی بہار) کا ایک واقعہ سنیے)

''مدھوبنی کانفرنس کے لئے جو وفد مقرر ہوا اس میں میرے ساتھ ساتھ غلام سرور، جمیل احمد ایڈووکیٹ اور زین العابدین تھے۔ مغرب کے وقت یہ قافلہ روانہ ہوا۔ کم کرایہ پر ایک خستہ حال گاڑی ایمپیسیڈر لی گئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا، شرف الدین پور کی طرف گاڑی بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کا بریک فیل ہو گیا۔ روشنی نے کام کرنا بند کر دیا۔ گاڑی سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ ہم لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ ڈرائیور کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ آگے پل اور ندی تھی۔ میں نے کلمہ کا ورد شروع کیا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ گنے کے کھیت میں لڑھکتی چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ آگے کا بایاں دروازہ کھلا اور اچانک کوئی چیز دھب سے گر گئی۔ (آگے کی سیٹ پر غلام سرور بیٹھے تھے)۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ چند لمحوں بعد ہم سب کے ہوش درست ہوئے۔ لیکن غلام سرور نہیں تھے۔ اضطرابی کیفیت میں اندھیرے میں چیخنے لگا۔ دور سے آواز آئی، قمر اعظم میں یہاں ہوں'' تو ڈھارس ہوئی اور آواز کی سمت بڑھے۔ قریبی گاؤں سے کچھ لوگ لاٹھیاں اور لالٹین لے کر آ گئے۔ آخر غلام سرور تک ہم لوگ جا پہنچے۔ انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کی۔ ہم سب مجموعی طور پر محفوظ رہے اور ''شہیدان اردو ہوتے ہوتے بچے''

(خودنوشت سوانح پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، صفحہ ۶۲-۶۹)

ان میں غلام سرور کی اس تحریر کے کچھ حصے کو پیش کر دیتا ہوں جو انہوں نے بحیثیت اسپیکر اپنی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر لکھی تھی جو ان کی بہار ریاستی انجمن ترقی نے اپنے ایک سوئینیر میں شائع کی ہے۔

انہوں (غلام سرور) نے یہ لکھا کہ مشرقی پاکستان کے پہلے اور آخری دورہ کے موقع پر پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح نے ایک عظیم جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میں آپ پر

واضح کر دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان لازماً اردو اور صرف اردو ہوگی۔ اسی شام مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے وجود کی بنیاد پڑ گئی۔ دنیا میں زبان کی بنیاد پر کسی ایک آزاد ملک کے قیام کا شائد یہ تنہا اور پہلا واقعہ تھا۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد (۱۹۷۱ء کے بعد) آج سے پچیس سال قبل اردو اکھاڑ کر پھینک دی گئی۔

اب ذرا دیکھئے، مغربی پاکستان میں اس کا کیا حشر ہوا۔ صوبہ سرحد میں پشتو، پنجاب میں پنجابی، بلوچستان میں بلوچی، اور سندھ میں سندھی زبانوں کا چلن ہے۔ اردو بے پناہی کے عالم میں زندہ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اردو کے بہت بڑے نام لیوا مولوی عبدالحق اپنا وطن (حیدرآباد) چھوڑ کر کے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کراچی منتقل ہو گئے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کسی مجبوری (مثلاً فرقہ واریت اور نوکری وغیرہ) کی وجہ سے کراچی اور دوسرے شہروں میں ہجرت کیا۔ احساس محرومی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کے صدر مولوی عبدالحق بوریا بستر باندھ کر حیدرآباد سے اردو کو وہیں چھوڑ کر پاکستان روانہ ہو گئے۔

آزاد سیکولر سوشلسٹ جمہوریہ ہند کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو اور جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار (مجنوں کی ڈائری، لیلیٰ کے خطوط کے مصنف) کو نامزد کر دیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے علی گڑھ جانے کے بعد انجمن کا صدر دفتر سلطان جہاں منزل علی گڑھ منتقل ہو گیا۔

دفعہ ۳۴۷ دستور دفعات دستور ہند کے مطابق یوپی سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں بائیس لاکھ دستخط اور بہار سے اردو وفد لیڈی انیس امام ایم۔ایل۔سی۔ اور غلام سرور کی سربراہی میں جمہوریہ ہند کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے پاس علاقائی زبان بنانے کے لئے جمع کر دیا۔

چالیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا۔ یوپی میں حالات جیوں کے تیوں ہیں۔

مگر بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان ہو گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یوپی تحریک کی قیادت Urban Elite کے ہاتھوں رہی اور بہار میں عام لوگوں، اور سرفروشوں کے ہاتھ رہی۔ (انہوں نے کانگریس کی مخالفت بھی کی) ایسے لوگ بھی موجود رہے جو ملائی کھاتے رہے اور شاہ کو دعائیں دیتے رہے۔ لیکن اب بھی، ہمیشہ کی طرح اقتدار کو زلیخا کو ٹھوکریں مارنے والے موجود ہیں............ اس لئے اردو آج بھی یوپی سے بہتر حالات میں زندہ ہے۔

(حوالہ مجلّہ ۱۰/جنوری (1995) غلام سرور کی سالگرہ ۷۰ ویں سالگرہ صفحہ ۱۸)

اس سلسلے میں ہم کچھ اور باتیں یاد دلا دیں۔ بہار کی راجدھانی پٹنہ میں ۳/۔۴/دسمبر ۱۹۶۵ء میں ایک اردو کنونشن کا انعقاد ہوا جس کا خطبہ افتتاحیہ کانگریس کے مشہور رہنما ڈاکٹر سید محمود نے دیا تھا۔ انہوں نے خاص طور سے اپنا موقف لسانی نقطہ نظر سے پیش کیا۔ ان کی تقریر کی کچھ اہم باتیں درج ذیل ہیں۔

''ہم اپنے ملک میں اردو زبان کو بعض حصے میں دوسرا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ گزشتہ چالیس پچاس سال کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ تقسیم ملک کا ایک بڑا سبب اردو کو نظر انداز کرنے کی کوشش بھی ہے۔ اسی جذبے نے بڑھ کر تقسیم کے مطالبہ کی صورت اختیار کی۔''

آپ اس بات سے واقف ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم مذہب کے نام پر ہوئی۔ اور ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان کی تقسیم زبان کے نام پر ہو گئی اور مشرقی پاکستان (مرحوم) بنگلہ دیش کے نام پر ایک نیا ملک بن گیا۔

زبان کے مسئلہ پر انہوں نے (ڈاکٹر سید محمود) شمال اور جنوب کے اختلاف اور تفریق سے آگاہ کرتے ہوئے ''ہندی امپیریل ازم'' کا بھی ذکر کیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے زبان کے مسئلہ پر کئی ملکوں کی مثال پیش کی جہاں لسانی اقلیتیں موجود ہیں اور انہیں اپنی زبان کے استعمال میں رکاوٹیں ہیں۔

سوئزرلینڈ ایک ایسا ملک ہے جہاں چار زبانوں میں کام ہوتا رہتا ہے۔ کناڈا میں صدیوں سے انگریزی اور فرانسیسی میں اختلاف ہے۔

آئرلینڈ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ترکی کے کچھ حصے میں زبان کے موقف کو لے کر اختلاف کی وجہ سے ترکی کا بٹوارہ ہو گیا۔

جرمنی میں بھی پالش اور فرانسیسی آبادیاں تھیں۔ انہوں نے پہلی عالمی جنگ سے فائدہ اٹھا کر خود کو

آزاد کرالیا۔

روس میں زاروں کی حکومت کے زمانے میں جرمن پولش بولنے والوں پر تشدد ہونے کی وجہ سے ان لوگوں میں آزادی کی خواہش نے زور پکڑا اور عالمی جنگ اول کے بعد آزاد ہوگئے۔

ہمیں زبان کے مسئلہ پر انصاف کا راستہ اپنانا ہوگا۔ آخر میں انہوں نے ہندی کے انتہا پسندوں کو گرچہ اردو والوں کو ہندی کے قومی زبان بننے پر کوئی اختلاف اور اعتراض نہیں مگر وہ اردو کو اس کا جائز حق دینے سے گریز کررہے ہیں۔

۲۴ر ستمبر ۱۹۶۳ء میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی کا ایک وفد مسٹر ہردے ناتھ کنزرو کی قیادت میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملا اور میمورنڈم پیش کیا۔ جس میں خاص طور سے سہ لسانی فارمولا پیش کرتے ہوئے گفتگو کی گئی تھی۔ اس کے مطابق ہندی بحیثیت قومی زبان اور انگریزی یا کوئی جدید یورپین زبان کو لازمی طور پر طالب علموں کو پڑھنا ہے۔ اور شیڈیول ۸ کے مطابق ملک کی چودہ زبانوں میں جو جدید ہیں، ان میں سے ایک پڑھنا ہے۔ اس میں اردو شامل ہے۔ مگر اس کے ساتھ سنسکرت کو بھی شامل کر دیا گیا۔ لیکن سنسکرت چونکہ ایک کلاسیکی زبان ہے اس کو اس جدید زبانوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

۱۵ر اپریل ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید محمود اور بیگم انیس قدوائی ایم. ایل. سی نے ۱۰۴ مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ممبران پارلیمنٹ کے دستخط سے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں اردو کو جائز مقام دینے کی گزارش کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد میں بھی کانفرنس، کنونشن مختلف تاریخوں میں منعقد ہوئیں۔ ''بہار میں اردو تحریک'' غلام سرور کی قیادت میں جن کا انعقاد مختلف کنونشن، کانفرنس کے ذریعہ ہوتا رہا اس کی تفصیلی رپورٹ (۱۹۷۳) ہمارے تیسرے کتابچے: (۱۹۷۳) درج ہے۔

(یوم اردو حیدرآباد صفحہ ۱۰۰ (فروغ اردو) دہلی اردو کنوینشن ۱۷۸ (فروغ اردو) آل انڈیا اردو کانونشن ۱۸۵ (فروغ اردو) ۱۹۳ (فروغ اردو)

حیدرآباد اردو ہال کے جلسے یوم اردو کی صدارت کرتے ہوئے راجہ پرتاب گھیر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے خلاف کچھ غلط فہمیوں کی تردید ہونی چاہیے۔ (۱) اولاً اردو پاکستان کی زبان ہے اس

لیے غیر ملکی ہے اس سے زیادہ سفید جھوٹ شاید ہی ہو۔ پنجابی اور بنگلہ بھی ایسی زبانیں ہیں جو ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں پر بولی جاتی ہیں۔ (۲) دوم یہ الزام کے اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر ہے بھی تو کوئی جرم نہیں۔ مگر یہ الزام بھی غلط ہے۔ لاکھوں ہندو اردو بولنے والے ہیں۔ اور لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جن کو اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے تامل، بنگال، گجرات۔

(صفحہ ۱۰۵-فروغ اردو، اردو اور مہم نمبر ۱۹۶۸ء)

دہلی میں مئی ۲ر، ۳ر مئی ۱۹۶۵ء کو جب اردو کنونشن کا انعقاد ہوا جس کی صدارت صدر دہلی پردیش کانگریس جناب میر مشتاق نے کی۔ (فروغ اردو صفحہ ۱۷۸)۔ آل انڈیا اردو کنونشن کا انعقاد قیصر باغ لکھنؤ بتاریخ ۱۲ر اپریل ۱۹۶۴ء ہوا۔ جس کی صدارت جناب شیو پرشاد سنہا سینئر ایڈوکیٹ نے فرمائی۔

غلام سرور اپنے اخبار ''سنگم'' کے درجہ اول کے مشہور ایڈیٹر بھی تھے۔ لوگ ان کے اخبار کی سرخیوں اور ان کے اداریوں کو پڑھنے کے لئے ہر صبح منتظر رہتے تھے۔ وہ صرف اردو تحریک کی رہنمائی سے ہی منسلک نہیں رہے، بلکہ ملک کی اقلیتوں، دلتوں اور پسماندگان کے مسائل پر بھی توجہ دیتے اور ان کے لئے حق و انصاف کی آواز بلند کرتے رہے۔ یہاں پر اقلیتوں کے چند مسائل پر توجہ دینگے۔ مثلاً فلسطین کا مسئلہ ہو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کا مسئلہ ہو، ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکیاں ہوں، مشرقی پاکستان مرحوم جو بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آیا تو وہاں بہاری مہاجرین کے سنگین ترین حادثات وواقعات وغیرہ پر بھی ''سنگم'' کے اس صحافی کو سامنا کرنا پڑا اور اپنے قلم کا اعجاز دکھانا پڑا۔

۱۹۴۸ء میں برطانیہ، امریکہ اور روس کی حمایت سے یہودیوں کے لئے سرزمین فلسطین میں اسرائیل حکومت قائم کردی گئی۔ دنیا کے مغربی ممالک اور کچھ مسلم ملکوں نے بھی اسرائیل کو تسلیم کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہودی قوم بڑی ذہین ہے۔ امریکہ کی معاشیات کو کنٹرول کرنے میں ان کے بڑے اثرات کی بات کہی جاتی ہے۔ جرمنی میں ہٹلر نے یہودیوں پر بڑے ظلم کیے تھے۔ تاریخ میں ہٹلر کے شدید ظلم کی داستان محفوظ ہے۔ یہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن جب وہ خود اقتدار میں آئے تو فلسطینی مسلمانوں پر ان کا ظلم وستم بڑھتا گیا۔ مرحلہ اول میں اسلام کے ماننے والے مسجد اقصی کی جانب رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ملی کہ خانۂ کعبہ کی جانب رخ

کر کے اپنی عبادت کیجئے۔ بیشتر عرب ملکوں کی حکومت اسرائیل کی مخالف تھی۔ اوراس کی وجہ سے جنگیں بھی ہوئیں۔عرب حکمرانوں کی نظر اسرائیل کا قیام A dagger Thrust into Arab heart کے مترادف تھا۔ فلسطین میں مسجد اقصیٰ ان کے نشانے پر اب بھی ہے۔ یہ لوگ فلسطینیوں کے علاقے میں گھس کرناجائز طریقے سے اپنی کالونیاں (colonies) تعمیر کرتے رہتے ہیں۔

پٹنہ میں غلام سرور نے ایک خاصے بڑے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے یہودیوں کے ظلم وستم کے خلاف احتجاج کیا۔اس جلسہ میں فلسطین کی جانب سے ایک وفد بھی شامل تھا اوراس نے حکومت ہند سے تعاون اورانصاف کی درخواست کی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مختلف ریاستوں اورشہروں میں بڑے بڑے فساد خاصی تعداد میں وقوع پذیر ہوتے رہے۔ کانگریسی حکومت عام طور سے ان پر قابو پانے اورانصاف کرنے میں ناکام ہی ہوتی رہی۔غلام سرور کا اخبار''سنگم'' ان تمام واقعات کی دلدوز تصویریں پیش کرتا رہا۔غلام سرور کے اداریئے پیش ہوتے رہے۔ یہ بھی ایک بڑی داستان ہے جس کی تفصیلات یہاں پر ممکن نہیں۔

ملک میں مسلم اقلیت کے سامنے ایک اہم مسئلہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی آتا رہا۔اس کے اقلیتی کردار پر بھی سوال اٹھتے رہے۔کانگریس کے ایک مسلم وزیر کریم چھاگلا نے ایک تجویز پیش کی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے لفظ مسلم خارج کردیا جائے۔اس پر خوش آمدید کے ساتھ''واہ واہ'' کی آواز بھی بلند ہوئی۔اس کے تھوڑے عرصے کے بعد کریم چھاگلا مرکزی وزیر تعلیم نے جب بنارس ہندو یونیورسٹی سے ہندو لفظ ہٹانے کا اعلان کیا تو ان کی سخت پکڑ ہوئی اور بدترین طور پر نشانہ بنے۔اس سلسلے میں ایک واقعہ سنیے۔

مرکزی حکومت مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار تبدیل کرنا چاہتی تھی۔اس وقت غلام سرور کی شہرت بہار سے نکل کر دوسری ریاستوں میں پھیل چکی تھی ان کو خط، پوسٹ کارڈ، ٹیلی گرام کے ذریعہ اورآخر میں آدمی بھیج کراس کانفرنس میں خصوصی طور پرشرکت کی دعوت دی گئی۔ڈاکٹر جلیل فریدی، حیات اللہ انصاری اور دیگر افراد پر مشتمل ایک کمیٹی نے تجویز کا ڈرافٹ پیش کیا۔اور۱۹۵۴ء کے آئین کے مطابق حکومت ہند سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔غلام سرور نے اس تجویز پر ترمیم کر کے

ڈائس پر بھیج دیا۔ماہر قانون یٰسین نوری بار ایٹ لا بھی وہاں موجود تھے۔لیکن شاید کسی سازش یا بدنیتی کے تحت غلام سرور کی تجویز ترمیم کی ہوئی نظر نہ آئی۔غلام سرور نے پھر دوسری ترمیم بھیج دی جس میں اورحیثیتوں کے علاوہ مذہبی اور۱۹۵۰ء کے بجائے ۱۹۲۰ء کے آئین کے مطابق یونیورسٹی کا کردار قائم رکھنے کی گزارش کی۔ماہر قانون یٰسین نوری اورکچھ دوسرے نے ترمیم کی حمایت تسلیم کیا۔اس پر ایک آواز یہ بھی اٹھی کہ یہ کانفرنس تو علی گڑھ والوں کی ہے۔اس میں باہر کے غیر علی گڑھ کے کسی فرد کو بلانے کی کیا ضرورت تھی۔غلام سرور نے اس کا جواب دیا کہ میں خود نہیں آیا بلکہ بلایا گیا ہوں۔بے شک تمہارا رشتہ مسلم یونیورسٹی سے ماں اور بیٹا کا ہوسکتا ہے مگر میرا رشتہ ایک محبوب کا ہے۔تحریری طور پراس واقعہ کا ثبوت غلام سرور سے ذاتی گفتگو اوراخبار سنگم میں اوران کے ایک جانثار کے پاس موجود ہے۔

آپ ایک انتہائی اہم واقعے سے واقف ہیں۔سقوط مشرقی پاکستان کے بعد زبان کے نام پر ایک نیا ملک ۱۹۷۱ء میں وجود میں آگیا۔اندرا گاندھی، وزیر اعظم ہندوستان نے پاکستان کی فوج کی پنجابی اکثریت کے مقابلے میں بنگالیوں کی مدد کی۔پاکستان کی بدترین شکست اوراس کے ۹۳ ہزار فوجی ہندوستان کی قید میں آگئے۔تاریخ کا یہ ایک بے مثال سانحہ ہے۔بی. جے. پی. رہنما اٹل بہاری واجپائی نے انہیں ''درگا'' کا خطاب دینے کا اعلان کیا۔

اس تاریخی واقعہ پر بنگلہ دیش میں بہاری مسلمانوں (یعنی بہار، یوپی، مہاراشٹر اورکچھ دیگر علاقوں کے مہاجرین) پر کیا سنگین آفت ٹوٹ پڑی، بس پوچھیے مت۔ہندی مسلمانوں کے لاکھوں یا کروڑوں خاندان کا تعلق ان بہاری مہاجرین سے تھا۔وہ بے چین اور بے قرار ہوگئے۔ان پر جو گزر رہی ہے۔

یہاں پر یہ ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت غلام سرور نے ہی بڑے حوصلے سے''بہاری بچاؤ'' کمیٹی کا اعلان کیا۔اس کانفرنس کا انعقاد انجمن اسلامیہ ہال میں شام کے وقت ہوا۔اس میں سامعین کی کھچا کھچ تعداد موجود تھی۔اس کانفرنس میں تقریباً تمام مخالف پارٹیاں بشمول بی. جے. پی. کے بہار کے صدر ٹھاکر پرشاد بھی موجود تھے اور مقررین میں تھے۔اور یہ نعرہ بھی لگا کہ ہماری ہندوستانی فوج ابھی واپس نہ آئے۔ہندوستانی فوج نے بہاری مہاجرین کی اس وقت کافی مدد کی تھی۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کے دیگر مسائل مثلاً شادی اور طلاق، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف

قابل اعتراض کتابوں کی اشاعت پر گستاخ رسول کی مخالفت میں احتجاجات وغیرہ بھی ''سنگم'' کے صفحات میں بے باکی اور بے خوفی سے درج کیے گئے ہیں۔

محترمہ اندرا گاندھی دہلی سے پٹنہ کو روانہ ہوئیں تو انہوں نے کہہ دیا کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ کون کس کو ووٹ دیتا ہے۔

غلام سرور ایک عظیم صحافی تھے۔اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشہور شاعر پدم شری ڈاکٹر کلیم عاجز نے اپنی ایک شہرت یافتہ نثری تصنیف ''ابھی سن لو مجھ سے'' میں رقمطراز ہیں:

''غلام سرور کو میں تقریباً ۴۰ سال سے دیکھ رہا ہوں۔ان کی اٹھان ایسی تھی جس کا جہان رنگ و بو منتظر رہتا تھا۔ایسی اٹھان تھی جو انسان کے مقدر ساز ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔مسلمانوں کے جذبات میں روح پھونکی۔اپنی آواز بلند کرتے رہے..........غلام سرور شیر بہار تھے۔ان کی دہاڑ دور دور تک پہنچتی تھی۔ ان کے دل کا درد ان کی زبان سے نکل کر تیر و نشتر بن کر دلوں میں اتر جاتا تھا۔وہ واقعی دلیر تھے۔ان کا نظریہ سچا، پکا، کھرا، پاک وصاف اور بے داغ تھا۔

کلیم عاجز نے اپنی کتاب میں آگے بڑھ کر یہ بھی لکھ دیا کہ اگر وہ کہیں تو ان پر ایک کتاب بھی لکھ دوں۔

کلیم عاجز کی اس کتاب میں وہ دلچسپ واقعہ بھی درج ہے جب شمائل نبی نے پروفیسر جمیل مظہری کے اعزاز میں ایک کل ہند مشاعرہ کا انعقاد رام موہن رائے سیمنری کے میدان میں کرایا جس کی نظامت مشہور شخصیت ملک زادہ منظور کر رہے تھے۔اور صدارت بہار کے گورنر شری دیوکانت بروا کر رہے تھے۔ اس مشاعرے میں پروفیسر فراق گورکھپوری جیسا مشہور شاعر بھی موجود تھا۔ناظم مشاعرہ ملک زادہ کی زبان سے اردو کے حسین ترین الفاظ آبدار موتی کی طرح سامعین کے دلوں میں اتر رہے تھے۔جب کلیم عاجز مائک پر آئے تو انہوں نے یہ غزل پڑھی:

اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

اسٹیج پر بیٹھے ہوئے غلام سرور بے تحاشہ اتنی داد دینا شروع کی کہ غزل پڑھتے ہوئے کلیم عاجز، غلام

سرور کی داد، اور یہ شعر تینوں تاریخی ہو گئے کسی مشاعرہ کے لئے۔

آپ کو شاید یاد ہو کہ ہارون رشید کی کوششوں سے اور جگن ناتھ مشرا، وزیر اعلی کی مہربانیوں سے (۱۹۷۷ء) میں عبد المغنی کی انجمن کو گرانٹ کی منظوری ۵۰ رہزار سالانہ اور گورنمنٹ اردو لائبریری کے متصل حکومت کی نگرانی میں (۲۰ لاکھ) میں اردو بھون کی تعمیر بھی جلد ہی مکمل ہوگئی۔جس کی بالائی منزل میں انجمن ترقی اردو بہار کا دفتر شفٹ ہوگیا جہاں عبد المغنی تقریباً ہر شام پابندی سے بیٹھتے تھے۔مگر بہت حد تک اردو تحریک گرانٹ میں دب کر رہ گئی۔غلام سرور کانگریس مخالف پارٹی (کرپوری ٹھاکر) میں شامل ہو چکے تھے۔اس لیے وہ اپنی انجمن کے عہدہ صدارت سے الگ ہو گئے تھے اور ان کی انجمن خستہ حال ہو رہی تھی۔

آخر ۲۰۰۱ء کی صبح آفتاب نصف النہار پر پہنچا۔۱۱ ر بجے دن میں اردو بھون میں غلام سرور کی آمد ہونے والی ہے۔غلام سرور اور پروفیسر عبد المغنی کی ۲۶ ر برسوں کے بعد اردو کے ان دونوں رہنماؤں کے اتحاد اور ملاقات کے ہم لوگ ہال میں منتظر بیٹھے تھے۔فخر الدین عارفی نے نظامت کی کاروائی شروع کر دی تھی۔اور پھر ذرا ادھر دیکھئے حکومت زراعت کے وزیر غلام سرور کی آمد کی خبر ہوئی۔دو آدمی کی مدد سے کرسی پر بیٹھ کر وہ انجمن کی بالائی منزل پر پہنچے۔ان کی صحت نارمل نہیں تھی۔لنگی میں ہی ملبوس تھے۔وہ پیشاب کی تکلیف میں مبتلا تھے۔اور انہیں کیتھیٹر لگا ہوا تھا۔

ہال میں محبان اردو کی موجودگی میں غلام سرور نے خطاب کرتے ہوئے کہا اردو تحریک بہار میں ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک رہی۔ہم دونوں (یعنی غلام سرور اور عبد المغنی) ایک عرصے تک اس تحریک میں ساتھ رہے۔پھر درمیان میں فاصلے پیدا ہو گئے۔میری عمر اب کافی ہو چکی ہے۔اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اب میں آپ کے درمیان کب تک رہوں گا۔اب میں اردو تحریک کی مشعل پروفیسر عبد المغنی کے حوالے کرتا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ ان کے ہاتھوں اردو تحریک محفوظ رہے گی۔اب آئندہ وہی اس کی قیادت کریں گے۔

پروفیسر عبد المغنی نے ہال کے تمام سامعین و حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت آپ پر جیسے جذبات طاری ہیں ویسے ہی مجھ پر بھی طاری ہیں۔ہمارے درمیان کوئی رقابت نہیں۔ہماری محبت سچی ہے۔ہم دونوں ایک ہی شمع کے پروانے ہیں۔میں اردو کی شمع جو برادر محترم غلام سرور نے میرے

حوالے کی ہے انشاءاللہ اسے اردو کی نئی نسل کے حوالے کروں گا۔

۲۶ر برسوں کے بعد ۱۹۷۵ء کے بعد اتحاد ملن کی اس تقریب کی رپورٹ ''حلقۂ ادب'' کے ترجمان رسالہ ''مریخ'' جنوری-فروری ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۹۷۵ء کے دونوں رہنماؤں کے بعد ۳۱ر برسوں تک عبدالمغنی اردو تحریک کی قیادت کرتے رہے۔مگر وہ جوش نہ تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔وہ جو مولوی مدن والی بات تھی نظر نہ آئی ۔غلام سرور عہدہ وزارت میں اسیر تھے اور عبدالمغنی حکومت سے دی جانے والی گرانٹ میں دبے ہوئے تھے ۔اردو بے چاری پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ سطح پر کالج اور یونیورسٹی میں اردو کی خالی جگہوں پر اردو اساتذہ کی تقرری پر بے چینی سے منتظر تھی۔

اب اس واقعہ پر نظر ڈالیے۔چھپرہ میں پروفیسر عبدالمغنی کی انجمن ترقی اردو بہار کا انتخاب ہوا۔۱۹ر اکتوبر ۲۰۰۳ء جس میں چھپرہ کے ہی کسی اسکول یا مدرسہ کے استاد عبدالقیوم انصاری بھی صدر انجمن کی طرح بلا مقابلہ سکریٹری منتخب ہوگئے ۔جب انجمن کی گرانٹ جو بڑھ کر ۸ر لاکھ ہوگئی تھی، حکومت سے جا کر حاصل کی۔عبدالمغنی نے ان سے اخراجات کا حساب مانگا مگر دوسری طرف سے خاموشی رہی۔صدر انجمن نے انہیں رقم کی خرد برد کرنے کے الزام میں اپنے سکریٹری کو معطل کردیا۔انجمن کے کارگزار صدر ہارون رشید بھی عبدالقیوم انصاری سے جا ملے۔چنانچہ اپنے پرانے رفیق ہارون رشید کو بھی برطرف کردیا۔اس محاذ آرائی میں انجمن پھر تقسیم ہوگئی۔ہارون رشید صدر اور عبدالقیوم انصاری جنرل سکریٹری رہے۔مقدمے بھی ہوئے اور فیصلہ کے بعد ''اردو بھون'' پر عبدالقیوم کا قبضہ برقرار رہا۔ پروفیسر عبدالمغنی ''اردو بھون'' سے آوٹ کر دیئے گئے مگر ان کی جدوجہد اور عزم جاری رہا۔بدقسمتی سے عبدالمغنی جیسا دانشور غلام سرور سے اتحاد کے بعد محض چند برسوں (۵ سال) کے بعد ہی ۵ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو انتقال ہوگیا۔غلام سرور کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔(۱۷/اکتوبر ۲۰۰۴ء)۔ہارون رشید بھی اس دنیا کو الوداع کر چکے ہیں۔

مجھے کہنے دیجیے......اگر آپ کو اعتراض نہ ہو کہ غلام سرور اور عبدالمغنی جیسی عظیم شخصیتوں پر بہت سارے مقالے، مضامین، تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں۔اور ان کی کارگزاریوں پر آفتاب اور ماہتاب جیسی روشنی ڈالتے رہے ہیں مثلاً معروف صحافیوں میں ریاض عظیم آبادی، ریحان غنی، راشد احمد اور دیگر

نے جو کچھ لکھا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔اردو ڈائریکٹ کی جانب سے ریحان غنی کا پروفیسر عبدالمغنی پر ایک فرد نامہ شائع ہوکر مقبول ہوا۔غلام سرور اور عبدالمغنی اردو تحریک کو اپنی زندگی میں درحقیقت اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔اردو زبان و ادب، تہذیب و معاشرت، یک جہتی، رواداری، محبت، گنگا جمنی، تہذیب، حق و انصاف، امن اور شانتی اور ملک کی ترقی کے لئے پیہم جدوجہد کرتے رہے اور اپنے محدود دائرہ میں رہتے ہوئے جو کچھ کارگزاریاں کرسکے، وہ کرتے رہے۔ہمیں بھی اسے منفی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ مثبت پہلوؤں سے سمجھنا چاہیے۔

غلام سرور کے کچھ ہم نواؤں نے بھی ''غلام سرور مرکز تحقیق'' کا قیام کیا اور اچھا مجلّہ شائع کیا۔

ہارون رشید بھی ایک متحرک اور فعال شخصیت تھے۔وہ شاعر یا ادیب نہ تھے۔ایک مختصر مدت تک اپنا اخبار ''ہاتف'' کاولی منزل میں ایک شاندار دفتر قائم کرکے اس کی اشاعت جاری کی۔اکثر و بیشتر وہ اپنے فون اور کار کا استعمال کرنا خوب جانتے تھے اور اردو کے لئے پٹنہ (عظیم آباد) کی سڑکوں پر اپنی کار دوڑاتے رہتے۔ان کی زندگی میں ہی ان کی شخصیت اور کارناموں پر ایک کتاب مرتب ہوکر شائع ہو چکی ہے۔

غلام سرور جب حکومت بہار کے وزیر تھے، اس وقت بہار اردو اکادمی کے چیئرمین بھی تھے۔سید شاہ مشتاق احمد (سابق ایم۔ایل۔اے) غلام سرور کے دوست، صلاح کار اور سرپرست کی حیثیت سے برابر ان کے ساتھ رہے۔انہوں نے بہار اردو اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت سے غلام سرور کی معاونت اور مشوروں سے اردو اکادمی کے کئی خصوصی جلسوں کا انعقاد کرایا۔

۱۹۷۱ء کے بعد کی بات ہے بنگلہ دیش کی فاتح محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند نے مسلمانوں کی ناراضگی اور بدگمانی محسوس کرتے ہوئے اردو صحافیوں کی ایک کل ہند کانفرنس کے انعقاد کا اشارہ دیا۔ہندوستان کے اردو صحافی احساس کمتری میں مبتلا تھے۔کانفرنس کے بعد صحافیوں نے غلام سرور کو ہی کلیدی گفتگو کے لئے آگے بڑھا دیا۔اس دلیر صحافی نے اندرا گاندھی کے روبرو بہاری مسلمانوں پر ظلم وستم کے پس منظر میں انصاف کرنے کی آواز اٹھائی۔سنگم کے صفحات میں اس کی روداد موجود ہے۔بڑے صحافیوں نے بھی اعتراف کیا کہ غلام سرور تم نے ہم سب کی لاج رکھ لی۔

یادوں کے دریچے جب وا ہوئے تو کئی یادیں مجسم الفاظ کی صورت میں جلوہ گر ہونے لگیں۔غلام

سرور کے ایک ہم عصر طالب علم صابر آروی جو آگے چل کر ایک اعلیٰ عہدہ ملازمت پر فائز تھے اور بہار میں ایک معروف شاعر کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکے تھے انہوں نے ۴۸ سالوں کے بعد اپنا قلم اٹھایا اور لکھا کہ غلام سرور کی ذات طالب علمی کے زمانے سے ہی خود ایک انجمن تھی۔ان کی یادوں کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر کے پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

میٹرک کے بعد صابر آروی (مرحوم) آرہ کے بجائے جب پٹنہ آئے تو بی.این.کالج کے پرنسپل جناب معین الحق نے انٹرمیڈیٹ میں ان کے داخلہ اور ہاسٹل کے لئے فوراً حکم جاری کر دیا۔ان ہی ایام طالب علمی میں تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ساتھیوں اور دوستوں میں کلیم سہسرامی، یونس رمزی، نادم بلخی وغیرہ سے ملاقاتیں ہوتیں۔پھر اس کے بعد پٹنہ کالج کے اقبال ہاسٹل میں غلام سرور، طفیل احمد، شہباز حسین، علی حسین، منظر شہاب، اکرام شبنم، سعید اختر، افتخار رحمٰن، شکیل الرحمان وغیرہ سے تعارف ہوا۔

غلام سرور اقبال ہاسٹل کے جس کمرے میں رہتے تھے۔اس میں کبھی تالا نہیں لگاتے تھے۔بی.این. کالج، پٹنہ کالج اور سائنس کالج تینوں میں اردو کی ایک بزم قائم تھی۔غلام سرور نے تینوں کالجوں کے سکریٹریوں کو بلا کر یہ طے کرایا کہ جب کسی کالج میں کوئی جلسہ یا مشاعرہ منعقد ہو، سب کو معاونت کرنا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت یہ سارے اردو کے طلباء کتنے باصلاحیت تھے۔

انجمن اسلامیہ ہال میں اوپر کی منزل میں ایک طرف قاضی عبدالودود کا 'معاصر' رسالہ کا دفتر تھا۔اور ایک نام نہاد انجمن اور پرانی کتابوں کا ذخیرہ تھا تو دوسری طرف غلام سرور کے ''نوجوان'' ہفتہ وار کا دفتر تھا۔

آگے لکھتے ہیں کالج کی تعلیم سے ہی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے ایام طالب علمی سے ہی دو مایہ ناز طالب علموں نے کر دکھایا۔غلام سرور نے اپنے چند تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''پرکھ'' کے نام سے شائع کیا۔اور شکیل الرحمٰن نے اپنی کتاب ''ادب اور نفسیات'' شائع کی.................کالج کی زندگی سے ہی غلام سرور ماہر ''اقبالیات'' تھے۔ایم اے میں ان کا اسپیشل پیپر اقبال ہی تھا۔انہیں اقبال کے بے شمار اشعار یاد تھے۔انجمن اسلامیہ ہال میں ان کا قائم شدہ ''حلقہ ادب'' کا دفتر بھی تھا جہاں سے انہوں نے ''نوجوان'' ہفتہ وار کا ''ہم کیا کریں'' کی اشاعت کر کے سب کو دعوت عمل دیا۔کبھی کبھی غلام سرور اور ان کے کچھ دوست شام کے وقت جمع ہوتے تو ''بیت بازی'' کا سلسلہ شروع ہوتا۔سب لوگ ایک طرف ہوتے اور

انہیں اجازت تھی کہ وہ کسی شاعر کا کلام پیش کر سکتے ہیں۔دوسری طرف غلام سرور ہوتے اور وہ صرف اقبال کے شعر پیش کرتے۔

بقول صابر آروی، غلام سرور پڑھنے کے زمانے سے ہی نہایت باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے اور اچھے اچھے لطیفے بھی سناتے تھے۔اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی سنیئے۔طعام ولیمہ کی دعوت میں سہرا پڑھا گیا۔پھر یہ فرمائش ہوئی کہ ایک ایسا سہرا پڑھا جائے جس میں دولہا صاحب کی کھنچائی ہو۔کون پڑھے اس میں قرعہ فال میں غلام سرور کا نام نکل گیا۔غلام سرور کبھی بھی شاعر نہ تھے مگر انہوں نے کچھ مہمل مصرعوں کو ترتیب دیا۔اور ہر دو مصرعوں کے بعد ''سہرا'' کی جگہ ''صحرا'' کا لفظ استعمال کیا۔صابر آروی نے اس چھوٹے سے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا اس کو صرف میں بیان کر سکتا ہوں یا غلام سرور۔اس واقعے کو غیر اہم سمجھ کر ہم لوگ فراموش کر چکے ہیں۔

وہ کسی انجمن کی کارگزاریوں میں دلچسپی سے حصہ لے کر اسے پر اثر بنا دیتے۔مثلاً کنہیا لال کپور کا مزاحیہ فیچر ''غالب ترقی پسند شعرا کے درمیان'' یا ''روحوں کا مشاعرہ'' میں اختر اور ینوی کے ساتھ بہت تعاون کیا۔وہ خود غالب کا رول ادا کر رہے تھے اور صابر آروی صاحب پنڈت دیا شنکر نسیم بنے تھے۔

غلام سرور تقریر نہایت زور بیانی سے کرتے تھے۔سیرت النبیؐ کا جلسہ ہو، اردو کے کاز کے لئے ہو، یا سیاست کے پلیٹ فارم سے ہو...........اردو کو سرکاری زبان بنانے میں سنگ میل کا کام انجام دیا۔

(حوالہ غلام سرور، چند یادیں چند باتیں، مجلّہ غلام سرور، مرکز تحقیق)

اردو اکادمی کا رسالہ ''زبان و ادب'' نے گوشہ غلام سرور کی اشاعت کی۔اب کچھ معروف صحافیوں اور ادیبوں کے تاثرات پر ایک نظر ڈالئے۔وہ کیا کہتے ہیں۔ریاض عظیم آبادی لکھتے ہیں ''غلام سرور ہندوستان کے صحافیوں میں سب سے زیادہ ممتاز صحافی تھے۔یہ فیصلہ بہت مشکل ہے کہ ان کو ایک عظیم صحافی کہا جائے یا مایۂ ناز ادیب۔انہوں نے صحافت کو عملی میدان بنایا۔وہ ایک متوازن ناقد، بہترین تمثیل نگار، شاندار خاکہ نگار، معتبر تاریخ نویس اور اپنے قلم کے مانے ہوئے بے تاج بادشاہ تھے۔ان کا اداریہ اور واقعاتی رپورٹ بھی ایک ادبی شاہکار سے کم نہیں ہوتی تھی...........غلام سرور نے اردو تحریک کو اپنا ہتھیار بنایا اور مسلمانوں کے گھروں میں دبکے رہنے کے بجائے باعمل بننے کی ترغیب دی۔انھوں نے ایک ریڈیو

میں نشر ہونے والے مضمون (۱۴/جولائی ۱۹۴۷ء) میں عظیم آباد کی ۲۵ سالہ سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔اسی لحاظ سے وہ ایک معتبر تاریخ نویس ہیں۔وہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم بنانے کے مخالف تھے۔غلام سرور نے ڈرامہ نگاری پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔اقبال میدان حشر میں جو مشہور رسالہ نگار میں شائع ہوا تھا۔

(مضمون غلام سرور: ایک بلند پایہ ادیب اور صحافی)

ریحان غنی اپنے مضمون ''غلام سرور: ایک صاحب طرز صحافی میں رقمطراز ہیں۔''وہ آزاد ہندوستان کے صف اول کے صحافیوں میں سے تھے۔ان کا اپنا اسلوب اپنا انداز بیان ،اپنا ایک انداز فکر تھا............غلام سرور کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ''نوجوان'' سے لے کر ''سنگم'' تک کی جہاں بینی کو اپنی فطرت بنا کر کسی جمشید کا ساغر بننا پسند نہیں کیا..................غلام سرور جیسا صاحب طرز صحافی برسوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔''

میر تقی میر کا ایک شعر کیا خوب ہے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایک معروف صحافی راشد احمد بھی غلام سرور سے بے حد متاثر ہیں۔اور خود بھی انہوں نے ان کے رنگ کو اپنانا شروع کیا۔غلام سرور کو آزاد ہندوستان میں بہار کی اردو صحافت کا ایک مستحکم اور مضبوط اور نمایاں ستون مانتا ہوں..................غلام سرور نے صحافت میں کم از کم احتجاجاً Blank Editorial کو رواج دیا۔جمہوریت میں بولنے کی آزادی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔غلام سرور کا یہ موقف تھا کہ اگر جمہوریت یہی ہے تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔یہ خاموش احتجاج بھی لوگوں میں زبردست اضطراب پھیلانے میں نہایت معاون ثابت ہوا۔

(یہ تینوں حوالے زبان وادب،جنوری ۲۰۱۲ء سے ماخوذ ہیں)

۱۹۷۵ء میں تقسیم ''انجمن'' اور غلام سرور سے پروفیسر عبدالمغنی کے اختلاف کے بعد بھی حسب ذیل اظہار خیال کیا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آزادی ہند کے بعد بہار میں غلام سرور کی صحافت نے سیاست میں قابل

ذکر اور اہم رول ادا کیا اور وقت کی ابھرتی ہوئی نئی نسلوں پر ایک اثر ڈالا ہے۔ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے نوجوانوں کے اندر ناموافق حالات سے لڑنے کے لیے حوصلہ پیدا ہوا۔بہار کی دو عظیم الشان اردو تحریک کو ابھارنے اور آگے بڑھانے میں ایک مدت تک غلام سرور صاحب نے کلیدی اور تاریخی رول ادا کیا............۔

(ماخوذ،زبان وادب جنوری ۲۰۰۱ء)

انجمن اسلامیہ ہال میں غلام سرور،اسپیکر،بہار قانون ساز اسمبلی کسی استقبالیہ جلسہ میں مدعو کیا گیا۔(تاریخ یاد نہیں)۔غلام سرور نے اپنی تقریر میں اردو کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اردو اب شاید پچاس سالوں سے زیادہ زندہ نہ رہے گی۔اس جملے کو کہے ہوئے بھی شاید ۳۰/سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے اور غور کرنے کی بات ہے کہ غلام سرور ۲۰۰۴ء اور پروفیسر عبدالمغنی ۲۰۰۶ء جو اب ہم لوگوں کے درمیان نہیں رہے آئندہ آگے کی جدوجہد کے لئے کون ہستی ہوگی جس پر سب لوگ متفق ہوں گے؟

غلام سرور ہمارے درمیان نہیں رہے۔مگر دنیا میں کسی کے نہیں رہنے سے دنیا کی رفتار رُک نہیں جاتی ہے اور نہ دنیا کے کام بند ہو جاتے ہیں۔

اجتماعی طور سے ہمیں اس بات کی کوشش جاری رکھنی ہوگی کہ اردو ہمارے گھروں میں زندہ رہے۔نیز ہمیں اردو طبقہ کی بڑی تعداد میں ان شائقین اردو،اور 'دشمنان تہذیب' (گرچہ شعوری طور پر ہوں یا نہ ہوں) انہیں سمجھانا ہوگا کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو اردو سے محروم نہ کریں۔ہمیں ''اردو کلب''،''اردو لائبریری''اردو کی نشستوں وغیرہ جیسی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ہوگا۔حکومت وقت سے اپنے سلیقہ سے انداز گفتگو میں گاہے بگاہے مطالبات پر انصاف (دستور ہند کے مطابق) کرتے رہنا ہوگا۔ہندی کو بہ سروچشم ہم تسلیم کر چکے ہیں۔اردو کی موجودگی ہندی کو بھی نکھارنے اور سنوارنے میں مدد کرتی ہے۔اور یہ سلسلہ جاری بھی ہے۔اردو کے قدیم و جدید شعراء و ادباء کی کتابیں کسی حد تک ہندی میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔غیر اردو داں طبقہ اردو اشعار سن کر سر دھنتا ہے۔

بقول یونس ہرگانوی ،صحافی اور ادیب لکھتے ہیں'' غلام سرور ایک جادو بیان مقرر خطیب ہیں۔منکرین بھی ان کی زور خطابت کا لوہا مانتے ہیں ۔وہ ادیب ہوں،صحافی ہوں یا سیاست داں ہوں ایک بات بالکل واضح ہے کہ وہ اپنے سینے میں بے حد مضطرب دل رکھتے تھے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی دعا'' خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے'' غلام سرور کو ایسی لگی کہ ان کے بحر کی موجوں میں اضطراب ہی اضطراب بھر گیا.................ان کی تقریر وتحریر میں ایک خاص بانکپن ہے جس میں'' بصیرت مومن'' انگڑائی لیتی ہے۔(حوالہ: مقالات غلام سرور ص ۷)

اب ہم غلام سرور کی صحافتی زندگی کی تفصیلات کو سمیٹتے ہوئے جو ۱۹۵۳ء'' سنگم'' ہفتہ وار پٹنہ سے ۱۹۶۳ء'' سنگم'' روزنامہ غالباً ۱۹۷۵ء تک براہ راست ان کی نگرانی اور ملکیت میں پابندی سے شائع ہوتا رہا۔اس میں ایسے کئی اداریئے ہیں جو عوام میں کافی مقبول ہوئے ہیں،ان اداریوں کا کوئی منتخب مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ انتہائی مشکل ہے کہ ان مشہور اداریوں کو'' سنگم'' کی فائلوں سے تلاش کیا جا سکے۔اور معلوم نہیں یہ تمام فائلیں ہر سال کی کس حد تک محفوظ ہیں۔بہرحال کچھ اداریئے جو میری نظر سے گزرے ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔

(۱) ''اردو اگر نہیں رہی تو کیا ہوگا''۔

(اداریہ سنگم مورخہ ۳/اپریل ۵۴، سنیچر)

(۲) ''اردو اب تک بہار میں کس طرح زندہ ہے ؟''

(مجلّہ یوم اردو، غلام سرور کی ۷۰ ویں
سالگرہ کے موقع پر ۱۰/جنوری ۹۵)

ابھی میں مذکورہ بالا اداریوں کی ایک تلخیص پیش کرتا ہوں۔

(۱) ''اردو اگر نہیں رہی تو کیا ہوگا''۔

غلام سرور اس اداریہ میں لکھتے ہیں کہ اگر بہار سے اردو ختم ہوگئی تو اس سے بہار کے ہندو، مسلمان ،سکھ، عیسائی، اچھوت بھی متاثر ہوں گے۔

اردو نہ رہی تو کیا ہوگا ؟ بہار میں اوسطاً تقریباً ایک ہزار مڈل اور ہائی اسکول میں اردو جاننے والے

اور اردو پڑھانے والے ۲۰۰۰ اساتذہ ہیں ۔ان کی روزی ختم ہو جائے گی ۔معاشیات میں پانچ ادیبوں پر اوسطاً خاندان لیا جائے تو گویا دس ہزار لوگ بے خانماں برباد ہو جائیں گے ۔ریاست میں اردو پڑھانے والے مدرسین ،ایل. بی، یو. بی، اسکولوں میں پانچ ہزار اساتذہ نہیں ہوں گے گویا پچیس ہزار لوگوں کی روزی چھین جائے گی.................

اردو نہیں ہوگی تو ساری ریاست میں رجسٹری آفسوں اردو میں دستاویز لکھنے والے...........تقریباً چالیس ہزار لوگ بے سہارا ہو جائیں گے۔

اسی طرح اردو کی کتابوں کی دکانیں، ناشر، مصنف، شاعر اور ادیب کیا کریں گے۔نہ صرف یہ کہ بہار میں اردو کے خاتمے سے صرف بہار کے لاکھوں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھ اور پنجابی برادری کی روزی روٹی ختم ہو جائے گی بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی اس کا اثر پڑے گا۔تیج، پرتاپ وغیرہ جو دلی پنجاب سے نکلتے ہیں متاثر ہونگے۔پھر ساری اردو آبادی خطرے میں پڑ جائے گی......وغیرہ

(۲) اردو ادب اب تک بہار میں کس طرح زندہ ہے؟

اردو نہ غیر ملکی زبان ہے،
اور نہ اردو پاکستان کی زبان ہے۔
اردو کا رسم الخط بھی غیر ملکی نہیں ہے۔
اس کا جواب ثبوت کے ساتھ دیا جا چکا ہے۔

...........بہار میں اردو آبادی کا وفد لیڈی انیس امام (ایم ایل سی) کی سربراہی میں دس لاکھ پندرہ ہزار دستخط ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں داخل کر چکا تھا۔یو پی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں ۲۲/ لاکھ دستخط صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد سے مل کر داخل کیا گیا تھا۔چالیس سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یو پی میں حالات جیوں کے تیوں رہے ۔لیکن بہار میں آخر ۱۹۸۱ء میں اردو دوسری سرکاری زبان بنادی گئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بہار میں اردو تحریک عوامی رہی......اور سرفروشوں کے ہاتھ میں رہی۔جبکہ یو پی میں اردو تحریک طبقہ اشراف Urban Elite کے ہاتھوں رہی جو اپنے مفادات کی قربانی اور اقتدار کی

چوکھٹ سے اپنی پیشانی ہٹانے کو تیار نہ تھے............

اردو آبادی نے اپنا یہ حق لڑ کر لیا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اردو کو الیکشن کا ایشو بنایا گیا۔

پورے ملک میں بہار ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو زندہ ہے اور اردو کا چلن ہے ....(غلام سرور کی ۷۰ ویں اور ۷۱ ویں............ کے حوالے سے)

ابھی اگست ۲۰۲۱ء میں کل ہند انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کے زیر اہتمام تلنگانہ، آندھرا پردیش میں ''اردو مسائل و امکانات'' سے آن لائین ایک نشست منعقد ہوئی۔ اردو کے معروف صحافی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، (حیدرآباد) نے کہا: اردو طبقہ اپنی زبان کی جانب سے بیگانہ ہوتا جارہا ہے۔

ضرورت ہے کہ اردو کی تنظیمیں اور محبان اردو پرزور جدوجہد کریں کہ اردو ہمارے گھروں میں زندہ رہے۔

❋

غلام سرور کی سیاسی زندگی

عملی سیاست میں حصہ داری

۱۹۷۷ء کے بعد سے غلام سرور کی عملی سیاست کا دور شروع ہوا۔ اس کے پہلے وہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں تھے۔ وہ کانگریس پارٹی کے نہیں بلکہ کانگریس کی منافقانہ پالیسی سے برگشتہ اور اختلاف رکھتے تھے۔ اس لیے وہ کانگریس کی مخالف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۶۷ء میں انہوں نے اردو کو الیکشن ایشو بنایا اور کچھ مخالف پارٹیوں میں اردو کا منشور شامل کرانے کی حمایت حاصل کی تھی۔ انہوں نے ریاست کے وزیر اعلیٰ کے. بی. سہائے کو پٹنہ اور ہزاری باغ کی اسمبلی سیٹوں سے شکست دی تھی۔ اس وقت ان کی ایک بہترین خطیب اور ایک اعلیٰ درجہ کے مقرر کی حیثیت سے پوری ریاست میں شہرت ہوگئی۔ اور کانگریس کے مخالف امیدوار انہیں اپنے حلقہ میں ان کی حمایت میں تقریر کرنے کی گذارش کر کے انہیں لے جانے کی بھرپور کوشش کرنے لگے۔ چنانچہ اسی سال کانگریس کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور پہلی بار ایک غیر کانگریسی سرکار بہار میں شری مہامایا پرشاد کی وزارت اعلیٰ میں تشکیل پائی۔ اس حکومت میں غلام سرور نے وزیر بننے سے انکار کر دیا تھا۔

پچھلے اوراق میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ غلام سرور نے اپنی زندگی کا نصب العین صحافت کو بنایا تھا۔ صحافت کا تعلق سیاست سے ناگزیر ہے ایک ایماندارانہ صحافی اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ملک اور ریاست کی سیاسی گرہوں پر نظر رکھتا ہے، جائزہ لیتا رہتا ہے اور عوامی رائے بھی بناتا ہے جو جمہوریت کے لیے ضروری ہے۔

❋

غلام سرور کی سیاسی زندگی کا آغاز

غرض غلام سرور کی اپنی سیاسی زندگی میں ۱۹۶۷ء سے اپنی پیہم جدوجہد، اپنی تحریر اور مدبرانہ تقریروں سے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔اور پہلی بار جو غیر کانگریسی سرکار بنی اس میں بحیثیت وزیر شامل نہ ہوئے۔لیکن ۱۹۷۷ء میں جب وہ عملی سیاست سے سیوان سے جیت کر ایم.ایل.اے. ہوئے تو آخر وزیر اعلیٰ کرپوری ٹھاکر نے انہیں وزیر تعلیم (ثانوی) بنادیا۔

ہم واقف ہو چکے ہیں کہ غلام سرور کو اپنی جدوجہد سے جیل کی صعوبتیں بھی مختلف موقعوں پر جھیلنی پڑیں۔پھر ''سنگم'' اخبار کے روزنامہ ہونے کے بعد شاید ۱۹۶۷ء کے بعد سے ہی انہوں نے اپنے دفتر سنگم کے سامنے ہی ایک کرایہ کا فلیٹ لے لیا۔دو کمروں کا یہ فلیٹ چھوٹا تھا جس میں کئی برسوں تک غلام سرور نے تکلیف اٹھائی اور آرام وکشادگی کی زندگی سے دور گزر بسر کرتے رہے۔ میں خود اس بات کی گواہی دیتا ہوں۔

پھر انہوں نے اپنا ایک خواب بھی پورا کیا۔اور نوری مسجد کے پیچھے انہوں نے عظیم آباد پبلکیشنز کی عمارت تعمیر کرائی اور اس میں ایک پرنٹنگ پریس لگایا۔ پھر وہ اس چھوٹے سے تکلیف دہ فلیٹ سے منتقل ہو کر یہاں آ گئے اور روشنی وہوا کی تسلی بخش آمد سے سرفراز ہوئے۔

۱۹۷۷ء میں وزیر تعلیم ہونے کے بعد وہ حکومت کے تعمیر شدہ شاندار بنگلہ میں رہائش پذیر ہوئے۔اس کے آگے ایک کھلا ہوا میدان بھی تھا۔قانون کے مطابق ان کی اس عمارت میں سیکورٹی گارڈ بھی آ گئے۔پھر وہ ۱۹۹۰ء میں ۵؍برسوں تک کے لئے بہار قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بھی منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء اور ۲۰۰۰ء میں وزیر زراعت کے عہدہ پر بھی رہے۔

اب اپنے ہی لوگوں میں اس بحث کا آغاز ہوا کہ اپنی حکومت اور وزارت کے دور میں انہوں

نے کیا کیا۔ان ناعاقبت اندیش حریفوں کو یہ نہیں معلوم تو ان کی کم ظرفی کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔وہ اپنے فرائض حکومت میں ذمہ داری سے کام کرنے لگے۔ پہلے اپنے شعبہ کی فائلوں میں منہمک ہو کر مطالعہ کرتے رہے۔اور ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہی حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلا سکتے تھے۔

بہت ساری تکلیفوں اور نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے تھوڑا آرام ملا تو اس پر حسد کی قطعاً گنجائش نہیں۔مگر پھر بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے دل اور دماغ اضطراب سے خالی نہ رہا۔ ظاہر ہے اب پیہم جدوجہد کے بعد حکومت میں جب گدی ملی تو فرق کا ہونا لازمی تھا۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ 25 جولائی 1975 میں ملک کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگا دی۔اس وقت شری جے پرکاش اندرا گاندھی اور ایمرجنسی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔اور مکمل انقلاب کا نعرہ دیا۔غلام سرور نے بھی ان کی حمایت کی۔آخر کچھ مہینوں بعد ہی انہیں ایمرجنسی ہٹانی پڑی۔انتخاب ہوا تو اندرا گاندھی کو شکست ہوئی۔پھر ۱۹۸۰ء میں اندرا گاندھی کی واپسی ہوئی اور ریاست بہار میں دس برسوں تک کانگریس کی حکومت رہی۔

اس کے بعد پھر غیر کانگریسی سرکار کا دور آیا۔غلام سرور سیاست میں اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ جگن ناتھ مشرا،ستیندر نارائن سنہا، کیدار پانڈے وغیرہ بہار میں کانگریس کے وزیر اعلیٰ بھی ہوئے۔اب اگلے انتخاب کی تیاری بھی تھی۔غلام سرور کانگریس کے مخالف سیکولر اور ترقی پسند امیدواروں کی حمایت میں رہتے تھے۔غلام سرور کے لیے ہوڑ بھی مچی رہتی تھی۔بہت سے امیدوار کانگریس کے مقابلے میں سرور صاحب کی تقریر کی وجہ سے کامیاب بھی ہوتے رہے۔ایک دلچسپ واقعہ سنئے:

ایک دن اچانک شری کیدار پانڈے (سابق وزیر اعلیٰ بہار) دفتر سنگم لالہ زار منزل سبزی باغ آ پہنچے۔دفتر میں ایک ہی کرسی تھی جس میں غلام سرور براجمان تھے۔شری کیدار پانڈے کہنے لگے سرور صاحب بہار میں تین سو چوبیس کنسٹی چیونسی (اسمبلی) ہے سب پر آپ کا جانا ممکن نہیں۔براہ کرم میری کونسٹی چیونسی چھوڑ دیجئے گا۔ میں نے اپنے کچھ دوستوں سے دریافت کیا کہ غلام سرور کون ہے۔اس کا بہت نام سنتے ہیں۔ان لوگوں نے جواب دیا بس تین افراد کی منڈلی ہے۔ایک غلام سرور خود ہیں جو بہار ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔دوسرے مولانا بیتاب صدیقی ہیں جو رحمانیہ ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔اور تیسرے سید شاہ

مشتاق احمد ہیں جو پان کھا کر ہر جگہ پیک پھینکتے رہتے ہیں۔کوئی چوتھا نہیں ان کے ساتھ ۔ہم بھرم میں رہ گئے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری سرکار بنی تو اردو کے لئے جو ہو سکے گا کروں گا۔اور واقعی انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔انہوں نے پرائمری اور ثانوی سطح پر (چاہے اردو کا ایک طالب علم کیوں نہ ہو) سے متعلق سرکلر جاری کردیا۔(بہ حوالہ خطبات)

بہرحال ہر دور میں اعتراض کرنے والے موجود رہتے ہیں۔کچھ لوگوں نے یہی سوال کیا غلام سرور نے اپنے دور وزارت میں میں کیا کیا ؟ غلام سرور بہ شکل وزیر تعلیم (ثانوی) ڈھائی سال ہی رہے۔آپ درج ذیل تحریر پڑھیے جو ایک مانے ہوئے دانشور پروفیسر عبدالمغنی نے لکھ دی ہے۔

''غلام سرور کی شخصیت، چٹانی عزم، آہنی ارادے اور ایک نہ تھمنے والے طوفان سے تعبیر ہے۔ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ''نوجوان'' سے ہوا۔ اس کے بعد ''ساتھی'' اور پھر ''سنگم'' کا اجراء کیا۔سنگم اپنے اولین شمارہ سے ہی حق کا ترجمان، مظلوموں کا نقیب، اور فرقہ پرستی کے خلاف ایک بااثر آواز بن گیا۔اسی کے ساتھ انھوں نے اردو تحریک، مدرسہ تحریک، بہاری بچاؤ تحریک، فلسطین بچاؤ تحریک، اصلاح وقف بورڈ تحریک چھیڑی۔سبھی تحریکات کے بانی وہ خود تھے۔اور ان سبھوں کے اطمینان بخش اور سودمند نتائج بھی سامنے آئے۔زندگی کے متعلق غلام سرور کا ایک مخصوص نقطہ نظر ہے۔انہوں نے نظریہ اسلام، نظریہ تعلیم، نظریہ زبان وادب، نظریہ سیاست، نظریہ صحافت، نظریہ وطنیت، نظریہ ملی قیادت، نظریہ حسب ونصب وغیرہ کو ایک خاص زاویہ نظر سے دیکھا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا اظہار بھی کیا۔ ان کے نظریہ میں توازن، وسعت نظر اور فکر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک بہت بڑا حلقہ ان کے نظریات و تحریکات کے زیر اثر آ گیا۔ بالخصوص آزادئ ہند کے بعد ان کی صحافت اور سیاست نے ایک قابل ذکر اور اہم رول ادا کیا۔اور خود وقت کی ابھرتی ہوئی نئی نسلوں پر ایک اثر ڈالا۔ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے نوجوانوں کے اندر ناموافق حالات سے لڑنے کے لیے حوصلہ پیدا ہوا۔''

(حوالہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی، ہمدم دیرینہ خصوصی شمارہ سنگم ۱۹۹۴ء)

ان کے یہ جملے بھی ملاحظہ کریں:۔

''بہار کی دو عظیم الشان تحریک اردو جن کے سبب بالآخر اردو آئینی و قانونی طور پر ریاست کی

دوسری سرکاری زبان بن گئی، اس کو ابھارنے اور آگے بڑھانے میں ایک مدت تک غلام سرور نے کلیدی اور تاریخی رول ادا کیا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ ایک مثالی واقعہ ہے جو پورے ہندوستان کی اردو دنیا کے لئے ''مشعل راہ بن گیا ہے۔''

گویا غلام سرور کی تحریکات و خدمات کو اس طرح پیش کر دیا ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دینا۔

اس سلسلے میں مشہور شاعر پروفیسر (ڈاکٹر) کلیم عاجز صاحب نے غلام سرور کا ذکر کرتے ہوئے ان سے چالیس سال کے تعلقات کو یاد کیا۔اور ان کی جرأت و بے باکی کی تعریف کی......ان کی شخصیت پر لکھنا ایک الگ موضوع ہے۔وہ لمبی کہانی ہو جائے گی۔وہ کہیں گے تو لکھ دوں گا۔وہ انمٹ ہو جائے گا۔

کلیم عاجز صاحب کی یہ تحریر ان کی مشہور نثری کتاب ''ابھی سن لو مجھ سے'' میں مزید طوالت سے درج ہے۔

غلام سرور نے حکومت بہار میں وزارت تعلیم (ثانوی) کا عہدہ سنبھالا (۱۹۷۷ء میں) تو سب سے پہلے دو چار مہینے پچھلی فائلوں کے مطالعے میں منہمک رہے۔اس کے بعد اردو مدرسہ تحریک کی جانب متوجہ ہوئے۔انہوں نے ہی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کا قیام کیا۔تقریباً چھ سو مدرسوں میں اردو ذریعہ تعلیم اور دینی تعلیم کے فروغ کے امکانات موجود ہیں، گرچہ مزید اصلاح کی ضرورت بھی لازمی تھی تاکہ سائنس، ٹیکنالوجی نیز علم کی بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ مطابقت ہو سکے اور قدامت پرستی کو بھی دور کیا جائے۔انہوں (غلام سرور) نے مدارس کی منظوری کے لیے اور اساتذہ کے لئے نئی شرح تنخواہ کی منظوری کے لئے خود ہی فائل لیے وزیر خزانہ حکومت بہار سے ملاقات کی۔ وزیر خزانہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ایسا کرنے سے بجٹ میں بہت اضافہ ہو جائے گا اور حکومت پر بہت بوجھ ہو جائے گا۔چنانچہ وہاں سے اٹھ کر وزیر اعلیٰ کرپوری ٹھاکر کے پاس پہنچے۔(ان کی جیب میں استعفیٰ نامہ بھی تھا) وزیر اعلیٰ نے وزیر خزانہ کو پھٹکار بھی لگائی۔آخر وزیر خزانہ نے بادل ناخواستہ دستخط کیا۔غلام سرور نے ہر مدرسہ میں یہ بھی شرط لگا دی کہ انہیں ایک حافظ قرآن کا تقرر بھی کرنا ہوگا۔وزیر اعلیٰ کے دستخط کے بعد گورنر سے بھی ملاقات کی۔
حافظ قرآن کا بھی گزٹ سے نوٹیفیکیشن ہو گیا۔نئی شرح تنخواہ پر محکمہ وزارت پر کچھ لوگوں نے

سوال اٹھایا کہ ان کا چپراسی کی شرح تنخواہ پر تقرر کیا جائے گا۔ تب غلام سرور نے کمشنر، اسپیشل سکریٹری اور ڈائریکٹر کو بلایا۔ محکمہ نے بتایا ان کے پاس ایم.اے. بی.اے. یا میٹرک ڈگری نہیں ہے۔ غلام سرور نے انہیں بتایا کہ حکومت نے فاضل ، عالم، فوقانیہ کو ایم.اے. بی. اے.اور میٹرک کے مساوی (equivalent) تسلیم کرلیا ہے۔ اسی کے مطابق ان کی تنخواہ مقرر ہوگی۔ چنانچہ نئی شرح تنخواہ اسی کے مطابق طے ہوئی۔ کیا یہ اہم کارگزاری نہیں ہے؟

ایک گفتگو میں غلام سرور نے مجھ سے کہا کہ ہم نے حافظ قرآن کی تقرری کر دی ہے۔ شاید میرے لئے یہی راہِ نجات ہوجائے۔

دوسری بات غلام سرور کے دور میں ہی ثانوی سطح کی مفت تعلیم (سرکاری اسکولوں میں) کا اعلان ہوا۔

غلام سرور ۹۰/۳/۲۰ سے ۹۵/۴/۹ تک بہار قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے درمیان اپنے عہدہ پر رہتے ہوئے اسمبلی کی کاروائی بغیر کسی تفریق اور عصبیت کے پانچ سال خوبی کے ساتھ چلائی۔

انہوں نے ۱۹۹۲ء میں شعبہ اردو کا قیام کیا اور خاصی تعداد میں اس کے لیے اردو ملازمین کی بحالی کی۔

پوری ریاست میں اوقاف اور زمین کا سرمایہ موجود تھا۔ جس سے اچھی آمدنی ہوتی تھی اور تعمیری کام ہونے کی گنجائش تھی۔ چند کو چھوڑ کر کئی متولیوں نے وقف کی زمین کو فروخت کیا اور حصول رقم میں بدعنوانی کرتے رہے۔

۱۹۹۴ء میں انہوں نے پہلی بار اسمبلی میں وقف کی اصلاح کے لئے بہار سنی بورڈ سے رپورٹ طلب کی۔

اختصار میں ہم نے کچھ کارگزاریاں پیش کر دی ہیں۔ جرمنی سے پروفیسر ہیم چندر جھا نے غلام سرور کو مبارکباد دی اور کہا کہ آپ نے کیوٹی کانسٹی چیونسی میں بہت کام کیا۔ میں اسی علاقہ کا رہنے والا ہوں ۔وطن واپس آؤں گا تو آپ سے ملاقات کروں گا۔ اور جرمنی آنے کی دعوت بھی دونگا۔

ایک گفتگو میں غلام سرور نے میری موجودگی میں یہ بات کہی کہ ایک ہزار برس کی بالا دستی کے باوجود مسلمان بادشاہوں نے کوئی مکتب، اسکول، کالج، یونیورسٹی کا قیام نہیں کیا۔ ایک بھی نہیں۔ تعلیم کے لئے جو بھی کیا وہ اولیاء کرام، صوفیوں اور خانقاہوں نے کیا۔

غلام سرور کی کارگزاریوں سے متعلق ان کے ایک عقیدت مند اور مداح نے گنتی کراتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں جو وزیر/اسپیکر موصوف کی سترہویں سالگرہ اور یوم اردو کے مجلّہ مورخہ ۱۰/جنوری ۱۹۹۵ء کے مجلّہ میں شامل ہے، آخری سطر میں یہ لکھ دیا ''انسانیت کا یہ پیکر میری نظر میں علامہ اقبال کے تصور خودی کا ترجمان ہے جو بھید بھاؤ کی ہر قید سے آزاد ہے۔

(جلسہ یوم اردو، زیر اہتمام، بہار ریاستی انجمن ترقی، ص ۳۲)

نثار احمد، نائب صدر بینک ایمپلائز فیڈریشن آف انڈیا، سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ وہ ''مرد مومن'' کی منزل تک پہنچ گئے تھے، مگر یونس ہرگانوی، ادیب اور صحافی نے ''مقالات غلام سرور'' مرتب کرتے ہوئے اپنے مقدمہ میں جو باتیں توازن کے ساتھ تحریر کی ہیں وہ قابل غور ہیں کہ ''ان کی تحریر وتقریر میں 'بصیرت مومن' انگڑائی لیتی ہے۔ 'بصیرت مومن' کی تمنا بہت سارے افراد میں رہی ہے اور آگے بھی ہوتی رہے گی انشاءاللہ۔

غلام سرور نے صرف سیاسی تقریریں ہی نہیں کیں بلکہ ادبی دینی و مذہبی جلسوں میں بھی ان کی تقریروں کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ انہوں نے ''سیرت النبی'' کے جلسہ میں بھی شرکت کی اور آسان زبان میں زور خطابت دکھایا ہے سیرت النبی کے ایک جلسہ شیخوپورہ میں تقریر کے اختتام کے بعد ایک ضعیف ہندوان کے پاس آکر بولا،'' آج ہم نے سمجھا کہ محمد ﷺ صاحب کون تھے اور ان کا کیا اپدیش تھا۔ یہاں ہر سال جلسہ ہوتا ہے اور ہم اس میں شرکت کرتے تھے۔ مگر بیچ بیچ میں مولوی صاحب کچھ عربی میں پڑھتے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ آج آپ کی تقریر سے سمجھ میں آیا۔

غلام سرور سبھی فرقوں، طبقوں یا ذاتوں کے درمیان رواداری پسند کرتے تھے۔ اور اس کی عملی مثالیں بھی پیش کرتے رہے۔ یہاں ایک واقعہ کی یاد دلا دیں۔ شاید یہ ۱۹۷۲ء کے بعد کا واقعہ ہو۔ آر. ایس. ایس. (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے چیف شری دیورس پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ غلام سرور نے اپنی طرف

سے دعوت دی جسے انہوں نے قبول کیا۔ چنانچہ غلام سرور نے اپنے سینکڑوں ہمنواؤں کے ساتھ فریزر روڈ کے ایک ہوٹل میں دعوت کا اہتمام کیا۔انہوں نے آر.ایس.ایس.۔کے چیف شری دیورس کا بڑے بھائی کہہ کر استقبال کیا اور انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کی طرف سے غلط فہمیوں کو دور کرنے کی وضاحت آمیز تقریر کی۔جلسہ بخیر خوبی انجام پذیر ہوا۔

❋

سفرنامہ حج

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

غلام سرور کے سفرنامۂ حج کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا نام انہوں نے دیارحرم پاک میں ہی ''پہلا وہ گھر خدا کا'' تجویز کر لیا تھا۔۲۰/ مارچ ۱۹۶۵ء میں اپنے گھر داناپور سے سعادت حج پر روانہ ہوئے۔ان کا یہ سفرنامہ کئی صفحوں پر مشتمل ہے۔اس لئے تفصیل کی گنجائش نہیں۔ان کا یہ سفرنامہ حج مضامین ''غلام سرور'' غلام سرور مرکز تحقیق نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔یہ سفرنامہ الگ سے بھی شائع ہوا ہے۔

نظارہ حج کا بیان قابل تعریف ہے۔لاکھوں فرزندان توحید دیوانہ وار اس کے گھر کا طواف کر رہے ہیں۔اذان ہوئی بس ہزاروں لاکھوں انسان چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔سجدوں کا رخ خانہ کعبہ کی طرف ہے۔ایک ساتھ جھکے،ایک ساتھ گرے،ایک ساتھ اٹھے،کہیں کوئی ناف کے اوپر ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور کہیں کوئی ہاتھ کھلا چھوڑ کے کھڑا ہے۔کہیں کوئی ٹوپی پہنے ہوئے ہے اور کہیں کوئی ننگے سر۔کہیں کوئی زور سے آمین کہہ رہا ہے اور کوئی آہستہ سے کہیں کسی ملک کا سربراہ اور دوسری طرف کسی ملک کا عام شہری۔کسی ملک کا وزیراعظم اور دوسرا عرب کا بھکاری،کوئی عربی ہے،کوئی عجمی ہے،کوئی ہندوستانی ہے،کوئی پاکستانی،کوئی مصری ہے،کوئی عراقی،کوئی ایرانی ہے،کوئی افغانی وغیرہ۔کسی کی زبان عربی،کسی کی اردو،کسی کی فارسی کسی کی فرانسیسی،سب کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے خانۂ کعبہ کی طرف منہ کئے ایک ہی صف میں کھڑے دعائیں مانگ رہے۔اور سبھوں کے لئے ایک خدا ہے۔ایک قرآن،ایک دین اور ایک اللہ کا رسول۔یہیں اللہ کی رسی لٹک رہی ہے،جس نے امیر وغریب،نسل اور رنگ،ذات اور برادری،علاقہ سرزمین کا امتیاز ہٹا کر ایک خدا کے سامنے ایک مرکز پر لا کھڑا کیا ہے۔اس سے بہتر دنیا میں ایسی مثال نہیں ملتی ہے۔

سوچو آج تم کن حالات میں گھرے ہو۔ زمانہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ چاروں طرف آگ کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ غرور زمانہ کھڑا مسکرا رہا ہے۔ لوگو! ذرا سونچو کیا ہم کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ تاثرات سے لبریز دل۔ اپنا بھی احتساب کیجئے۔ اور حسب ذیل اشعار ذہن نشیں کریں: (حوالہ: پہلا وہ گھر خدا کا)

غلام سرور کا یہ سفر نامہ حج دوسرے تمام سفرناموں سے مختلف اور منفرد ہے۔ ضروری نہیں کہ لمبی لمبی عربی دعائیں پڑھیں آپ اپنی زبان میں بھی یہ دعائیں مانگ سکتے ہیں۔

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابا خاک کا شغر

آپ کو خدا کا واسطہ، اب بھی بیدار ہو جائیے اور ساری دنیا میں انسانیت، امن شانتی، اخوت مساوات، بھائی چارگی، عالمگیر برادری، ہمہ گیر ابدی آفاقی قدروں کی دولت کو عام کر دیجئے۔

نثر نگاری کے نمونے

منتخب تحریریں (۱)

یہ قصہ ہے جب کا............

اکیس سال بیت گئے جب میں نے میٹرک پاس کر کے پٹنہ سائنس کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ادبیات سے دلچسپی اسکول ہی کے زمانے سے تھی۔ لیکن میٹرک نہایت اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا اور زمانہ کی روش یہی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر یا انجینئر یا سائنسدان بننے کے شوق نے سائنس کالج میں داخلہ لینے پر مجبور کیا۔ اس وقت بہار میں صرف ایک یونیورسٹی تھی اور وہ تھی پٹنہ یونیورسٹی۔ صوبہ بھر میں سائنس کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم بھی سائنس کالج میں دی جاتی تھی۔ علم ریاضی، علم کیمیا اور علم طبعیات سے واسطہ پڑ جائے تو ادب اور فن کا گلا گھٹ جاتا ہے۔ ادب اور زندگی اور ادب اور سائنس کی بحثیں بھی بہت ہی پرانی ہو چکی ہیں۔ اتنی بات طئے ہے کہ سائنس، انجینئر نگ یا میڈیسن میں جس کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس کا شاعری، جمالیات، ادبیات یا فنون لطیفہ سے عام طور پر دور کا بھی لگاؤ نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ انٹر سائنس میں لینگویج کمپوزیشن کا بھی ہوا کرتا ہے اور اسی مناسبت سے ہفتہ میں ایک گھنٹی ہماری اردو کمپوزیشن کی بھی ہوا کرتی تھی۔ بس اُسی گھنٹی نے مجھے سائنس داں، انجینئر اور ڈاکٹر نہیں بننے دیا۔ سائنس کالج میں اردو کا کوئی لیکچرار نہیں تھا۔ پٹنہ کالج کے سید اختر احمد اور ینوی لیکچرر شعبۂ اردو ہمارا کلاس لینے ہفتہ میں ایک بار سائنس کالج آتے۔ ایڈمنسٹریٹو بلاک کی عمارت میں ہمارا اردو کا کلاس ہوتا۔ اختر اورینوی کو پہلی بار میں نے اسی زمانے میں یعنی جولائی ۱۹۴۳ء میں اور اسی حیثیت سے یعنی اردو کے استاد کی حیثیت سے دیکھا اور

جانا۔قد گیسو معشوق کی طرح دراز، ناک نقشہ ایسا کہ منہ چوم لینے کو جی چاہے۔ چہرہ میں جمال اور آواز میں جلال۔زبان گنگا جل میں دھلی ہوئی دودھ میں نہائی اور گلاب میں بسائی ہوئی۔ بولی شہد سے زیادہ میٹھی۔ قہقہہ لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ استاد ولایت علی خان نے ستار کے سارے تار جھنجھنا دیے ہوں۔ چہرہ بُشرہ میں جاذبیت۔ بول چال میں کشش۔ درس تدریس میں دلچسپی وانہماک۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ پہلی نظر میں اختر اورینوی نے اپنا اثر چھوڑا، وہ آج تک دور نہ ہوا۔ درمیان میں میرے اختر صاحب کے تعلقات کشیدہ بھی ہوئے۔ تنقید نگار غلام سرور نے اختر اورینوی کے ڈرامہ پر سخت تنقید بھی کی۔ لیکن ایک شفیق استاد اور ایک خلیق انسان اور ایک رفیق ملک وملت کی حیثیت سے اختر صاحب نے جو نقش چھوڑا، وہ اکیس سال بعد بھی موجود ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ سائنس کے میدان سے ادب کی وادی میں میری واپسی، نیز قومی، ملی، سماجی، لسانی، اور ادبی میدان میں میری طبع آزمائیوں میں ابتدائی مرحلے میں جو اسباب کارگر ہوئے، ان میں ایک معتد بہ حصہ اختر اورینوی کا بھی رہا، تو اسے ہرگز مبالغہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اختر اورینوی نے بھی سائنس کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ دراز قد ہوتے ہوئے بھی حد درجہ ذہین تھے۔ آج بھی ان کی ذہانت کا چرچا عام ہے۔ انٹر سائنس کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ وہیں پھیپھڑے کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ دل کا روگ بھی اسی منزل پر مول لیا۔ اس امتحان میں پورا اترنے اور موذی مرض سے نجات حاصل کرنے کے بعد آرٹس کی طرف رجوع ہوئے۔ اور پھر بی.اے.، ایم.اے. اور اب تو ادبیات کے بھی ڈاکٹر ہو گئے۔ اختر اورینوی کا بچپن کیسا تھا، یہ ان کے لنگوٹیا یار آپ کو بتائیں گے، میں تو ان کا اسٹوڈنٹ تھا۔ سائنس کالج میں اردو کامپوزیشن کے استاد۔ پٹنہ کالج میں بی.اے.، میں پرنسپل اردو کے استاد اور ایم.اے. میں اردو کے استاد۔۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۳ء تک کا دس سالہ وقفہ میں نے اختر صاحب سے بہت قریب ہو کر گزارا ہے۔ دراصل یہ اسی وقت کا قصہ ہے جو آپ کو سناتا ہوں۔ وہ استاد کیسے تھے یا کیسے ہیں غالباً ان کے دوسرے شاگردوں نے اس پر قلم اٹھایا ہوگا۔ اختر صاحب صرف ایک پروفیسر ہی نہیں وہ محض ایک افسانہ نگار یا ادیب ہی نہیں بلکہ شخصیت کے رنگا رنگ میں اردو شاعروں کے معشوق کی طرح گلستان ہزار رنگ اور بت ہزار شیوہ۔ انہی میں چند رنگ میں آپ کو دکھاؤں گا۔ آپ دیکھئے اور پھر بتایئے کہ زبان، ادب، سیاست اور

انسانیت کے آسمان پر جو یہ سات رنگوں کا دھنک بصورت اختر نظر آ رہا ہے۔ اس کی یہ ہفت رنگی کیسی ہے۔

رنگوں کی بات آ گئی تو اسی زمانے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ بی.این.کالج کی بزم اردو کا سالانہ اجلاس تھا۔۵۰-۱۹۴۸ء کا زمانہ ہے۔ اختر اورینوی مائک پر ہیں اور زبان وادب کے موضوع پر تقریر کر رہے ہیں۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بات چل رہی ہے اِزموں کا تذکرہ ہونے لگا۔ سرخ اور گلابی کی تعریف کی جا رہی ہے۔ سامنے سہیل عظیم آبادی بیٹھے ہیں، جو اس زمانہ میں اپنے آپ کو ترقی پسند کہا کرتے تھے۔ اختر صاحب نے کہا کہ میرے دوست سہیل...... یہ تو نہ سرخ ہیں نہ گلابی، بلکہ پیازی ہیں۔ تہہ بہ تہہ رنگ بے رنگ۔ آخری تہہ کھول دو تو پھر کچھ نہیں۔ نہ مواد نہ رنگ.......... سامعین میں جو نوجوان طلبہ تھے انہوں نے قہقہہ بلند کیا اور سامنے کی صفوں میں بیٹھے ہوئے ادب نوازوں اور سخن فہموں نے اختر کی نکتہ رسی کی داد دی۔

ادب نوازوں اور سخن فہمی کا ذکر آ گیا ہے تو اس دس سالہ دور کی اردو لسانی وادبی تحریکات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ اس موضوع پر تفصیل سے دوسرے صاحبان قلم بھی خامہ فرسائی کریں گے۔ اس لئے یہاں چند واقعات کے ذکر تک اپنا بیان محدود کروں گا۔ اور یہ واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ شائد کسی نے کیا ہو۔ ۴۷-۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا جب ہندوستان کی چھتیس کروڑ آبادی آزادی' انقلاب، مسلم لیگ، کانگریس، پاکستان، اکھنڈ ہندوستان کے دور سے گزر رہی تھی۔ اسی اردو، ہندی، ہندوستانی مسئلہ کا سامنا بھی ہوتا تھا، تو اسے سیاسی بھول بھلیاں میں یہ مسئلہ گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ اردو کا رشتہ مسلم لیگ سے جوڑ دیا گیا۔ ہندی سے کانگریس کے ایک حلقہ کا سمبندھ ہو گیا تھا۔ آزادی کے فوراً بعد اردو، ہندی، ہندوستانی کے شاعر و ادیب اور افسانہ نویس کے اعصاب پر پنجاب کی پانچ ندیوں کا خون سوار ہو گیا۔ ہیر اور رانجھا کی روحوں نے فنکاروں کے دلوں سے اپنے بسیرے اٹھا لیے۔ بنگال کا جادو ہوا ہو گیا۔ پنجاب کا آہو چوکڑی بھول بیٹھا۔ خون کی ندیاں رہ گئیں۔ شاعروں نے انہی کے درد بھرے گیت گائے۔ افسانہ نگاروں نے اسی خون کی روشنائی میں اپنا قلم ڈال درد بھری کہانی سنائی۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور ہٹلر کی فوجیں سوویت روس کی سرحدوں میں داخل ہو گئیں تو نازی اور فسطائی طاقتوں کے خلاف اتحادی فوجوں نے تلوار سونت لی۔ وہیں دنیا کے فن کاروں نے ان فسطائی طاقتوں کے خلاف قلم اٹھا لیا۔ ان ہی ادیبوں، شاعروں،

افسانہ نگاروں اور فنکاروں کی صف میں اختر اورینوی بھی پیش پیش تھے۔

فنکاروں کے کارواں کے اگوائی دنیا کے ترقی پسند مصنفین کا منظم کردہ کر رہا تھا۔ ادھر جنگ ختم ہوگئی اور ادیبوں کی جماعت میں بھی Purging شروع ہوگئی۔ فوجوں کی لام بندی ایک جزو لازم ہے۔ سیاست میں صف بندی (Rejimentation) ہمیشہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ ادب میں تفریق من وتو (Water Tight Compartement) ایک لمحہ چلنے والی چیز نہیں۔ مگر انجمن ترقی پسند مصنفین کے فاتح فنکاروں نے اپنی صفوں کو ''رجعت پسند اور قدامت پسند'' عناصر سے پاک کر دیا۔ اختر اورینوی قلعہ سے باہر نکال دیے گئے۔ وہ زمانہ تھا جب آگے، خون، قتل، بربادی، جنگ فساد کے علاوہ شعر و ادب، مشاعرہ اور مناظرہ کی بات بھی کانوں پر گراں گزرتی تھی۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ برج بانو نے عرض پاک کا سفر اختیار کیا تھا۔ برج بانو کے مجنوں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی بھی پاکستان چلے گئے تھے۔ ہندی کو راج سنگھاسن پر بٹھانے کے منصوبے باندھے جانے لگے تھے۔ اردو کا نام لینا اور پاکستان کی حمایت کرنا مترادف سمجھا جانے لگا تھا۔ اسی زمانے میں عظیم آباد کے کچھ نوجوان اٹھے، کھڑے ہوئے اور پھر انہوں نے اردو کا نام لیا۔ رقیبوں نے تھانے میں جا کر جا کر رپٹ لکھوائی۔ انہوں نے اردو کا نعرہ بلند کیا۔ سیاست کے گرگ ہائے باراں دیدہ کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اردو کا پرچم اونچا کیا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں بہار میں صوبائی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سکریٹری تھا۔ اور اس کے ہفتہ وار سرکاری آرگن ''نوجوان'' کا مدیر اعلیٰ، بہار صوبائی مسلم لیگ کے علم برداروں نے اپنا سبز جھنڈا اتار کر اسے کفن کی سفید چادر اوڑھا دی تھی۔ اور خود مصلحتوں کی سہ رنگی چادر اوڑھ کر خاموش لیٹ گئے تھے۔ ہم بددل ہوگئے۔ مایوسی نے آدبوچا۔ پست ہمتی نے غلبہ کرلیا۔ لیکن رگوں میں وہ خون اب بھی دوڑ رہا تھا جو آنکھوں سے ٹپک پڑنے کو بے قرار رہتا ہے۔ اختر اورینوی نے صور پھونکا اور ہم قیامت کی نیند سے چونکے۔ اختر نے کہا کہ نوجوانو یہ گھڑی محشر کی ہے اور تم عرصہ محشر میں ہو۔ وقت خاموش بیٹھ رہنے جھنڈا گرا دینے اور مصلحت کے نام پر بزدلی دکھانے کا نہیں۔ عمل کے میدان میں کارگزاری کے گھوڑے پر سرگرمی کی تلوار چمکانے کا وقت ہے۔ نوجوان اٹھے ''حلقہ احباب نوجوان'' نام کی انجمن کی بنیاد پڑ گئی۔

اختر اورینوی رحیل کارواں کا کام انجام دے رہے تھے، کارواں پھر جادہ پیما ہوا۔ پیچھے مڑ کر

دیکھا تو اسد حسین نظر آئے۔ ان دنوں امریکہ میں ہیں۔ سید احمد پر نظر پڑی خرطوم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں، سعید اختر بھی تھے۔ سمڈیگا کالج کے پرنسپل ہیں۔ سید محمد عزیز ہاشمی ان دنوں موتیہاری کے کامیاب وکیل ہیں۔ محمد شہباز حسین جو 'آجکل' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔ سراج گیلانی ان دنوں لندن میں ہیں۔ ع م. ساجد محکمہ تعلیم میں ہیں۔ سید شبیر احسن بتیا کالج میں ہیں۔ سید احمد جوہتھوا میں پروفیسر ہیں۔ مرحوم سید ظل حسین، قمر التوحید جو حال ہی میں انگلستان سے واپس آئے ہیں اور بھاگلپور میں ہیں۔ ابرار الہدیٰ خان جو یونیورسٹی میں ہیں۔ محمد خلیل الرحمٰن، ایس. ایم. ہاشم، رضا دائروی، صبا کریمی، میاں محمد یونس، محمد عبا مہندوی، صفی احمد غنچہ، سید حسن بہپوری، ایس. ایم. اقبال، مشتاق احمد استھانوی، محمد طفیل مرحوم، ضیاء الرحمٰن وغیرہ ذہین اور سرگرم عمل نوجوانوں کا ایک قافلہ نظر آیا اور ہم آگے بڑھے ''حلقہ احباب نوجوان'' نے پہلے حلقہ ادب کا لبادہ اوڑھا پھر ''حلقہ ادب بہار'' بن کر بہار میں چھا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس ہوئی۔ ڈاکٹر سچدانند انجہانی نے اس کی مخالفت کی۔ پھر بھی کانفرنس ہو ہی گئی۔ اس موقع پر آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا۔ حضرت جوش ملیح آبادی میر مجلس تھے۔

اسٹیج پر حلقہ ادب کے سرگرم عمل اور دھن کے پکے نوجوان تھے۔ پردے کے پیچھے اختر اورینوی Prompter کے فرائض بہ طریق احسن انجام دے رہے تھے۔ نوجوان کا ''ہم کیا کریں'' نمبر شائع ہوا۔ میں نے لکھنؤ، علی گڑھ، دلی، کلکتہ کا دورہ کیا۔ اختر صاحب نے ہمت بندھائی اور ۱۹۴۹ء میں ہی نمبر منظر عام پر آیا۔ اختر اورینوی مشاعروں میں شعر پڑھتے۔ جلسوں میں تقریر کرتے۔ نجی صحبتوں میں مشورے دیتے، اسٹیج پر ایکٹنگ کے گر بتاتے۔ کلاس میں درس دیتے۔ بند کمرے میں شطرنج کی چال سکھاتے، آڑے وقتوں میں سے سر پر بن کر کھڑے ہوجاتے۔ ۱۹۵۱ء میں حلقہ ادب کا سالانہ اجلاس انجمن اسلامیہ ہال میں ہو رہا ہے۔ خیر ہودی علی گڑھ سے انجمن اردو ہند کے آرگنائزر کی حیثیت سے آئے ہیں۔ انصاری ہیں، نور ہیں، ایوب (مرحوم) ہیں، اختر ہیں، مظہر ہیں اور بے تاب بھی ہیں۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑتی ہے ادھر حلقہ ادب کے مقابلے پر بہار کی انجمن ترقی پسند مصنفین کمر کس کر میدان میں آگئی تھی تو اختر حلقہ کے ۱۳ نوجوان لیکر میدان میں اتر گئے تھے۔ ادھر پھر ایک جماعت مخالفت پر کمر بند نظر آئی تو ایوب، اختر، سردار اور بیتاب ان کے مقابلہ پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے

۔حلقہ ادب کے نوجوان کی مسیں بھیگ چکی تھیں ۔ بندہ خط کی آغاز کے منزل سے آگے آ چکے تھے ۔انہوں نے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی باگ دوڑ ہاتھ میں لے لی ۔ میں جنرل سکریٹری، بیتاب سکریٹری، اسد سکریٹری نشر واشاعت،سعید اختر نائب سکریٹری بنے۔مرحوم ایوب اُسی موڑ پر اردو کے قافلے کے ساتھ ہوئے اور چند برسوں میں ہی روح اور قائد اردو کی حیثیت اختیار کر گئے۔آزادی کے بعد دس سال تک پٹنہ کالج کے اندر اور کالج کے احاطہ سے باہر اردو کی ہر تحریک میں اختر اور بینوی متحرک نظر آئے۔ بزم اردو ہو یا حلقہ ادب بہار ہو یا انجمن ترقی اردو۔ ہر جگہ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک اختر اور بینوی مرکزی کردار کا رول ادا کرتے رہے۔مولانا بیتاب جو انجمن کے جنرل سکریٹری ہیں اور جنہیں اب مولانا اردو یا بیتاب اردو کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔وہ اختر صاحب کی ان سرگرمیوں کا ذکر کریں گے جن کا تعلق اردو تحریک یا انجمن اردو سے ہے۔ میں یہاں صرف ایک واقعہ بیان کر دوں جو شاید بیتاب کے ذہن میں نہ آ سکا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں اردو فارسی اور عربی کے شعبوں کو ضم کر کے ایک شعبہ بنانے کی اسکیم سامنے آئی۔اختر صاحب سیماب بن گئے۔حلقہ ادب کا میمورنڈم۔انجمن ترقی اردو کا وفد انجمن ترقی پسندوں کا احتجاج اخباروں کے مضامین کا تانتا بندھ گیا۔ پٹنہ سے دہلی تک ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔دلی قریب لے آئی گئی اور آخر یہ اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔اس کامیابی کا سہرا سب سے زیادہ اختر صاحب ہی کے سر ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چاہے میمورنڈم مرتب کرنا ہو یا وفد کی تشکیل کرنی ہو یا ڈرامہ اسٹیج کرنا ہو، اختر صاحب کی ضرورت ہر جگہ محسوس ہوتی رہی اور وہ ہر جگہ مستعد نظر آئے۔اسٹیج کے اوپر اختر کی صورت نظر آتی اور پردے کے پیچھے اختر کی آواز اُبھرتی۔

اسٹیج ڈرامہ کی بات آ گئی ہے تو میں ذرا آپ کو اس دنیا کی بھی سیر کرا دوں۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت اختر اور بینوی گویا پٹنہ کے آغا حشر ہو رہے تھے یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایک واجد علی شاہ اختر تھے کہ ڈرامہ، ناٹک اور اسٹیج ان کی تفریح طبع کے لئے تھے۔اسٹیج ہر وقت سجا رہتا تھا کہ کب تاجدار اودھ کا من چاہے اور وہ اس طرف آ دھمکیں۔اور دوسرے یہ سید اختر احمد اختر اور بینوی ہیں کہ یہ خود اسٹیج سجاتے، پردہ اٹھاتے، پردہ گراتے، وہی پروڈیوسر بھی تھے اور ڈائریکٹر بھی تھے۔ وہ بزم ادب پٹنہ کالج کے صدر رہا کرتے تھے۔اور ہر سال بزم ادب کا سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا۔ادبی دنیا میں اس

سالانہ تقریب نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔لوگ دور دور سے بزم کے سالانہ جلسہ میں اس غرض سے شرکت کرتے۔کبھی ابلیس کی مجلس شوریٰ بیٹھتی۔کبھی گزری ہوئی روحوں کا مشاعرہ منعقد ہوتا، کبھی چورنگی کا سماں ہوتا۔ پٹنہ کالج کے جمنازیم میں ڈرامے بڑے اہتمام سے ہوتے۔ جب تک ڈراپ سین نہ ہوتا، اختر کو قرار نہ ہوتا۔ جمنازیم میں ڈرامہ ہو رہا ہے۔زبان کا مسئلہ ڈرامہ کا عنوان ہے۔صرف پانچ کردار ہیں۔ میں پگڑ باندھے پنڈت پاکھنڈانند جی کا رول ادا کر رہا ہوں اور سنسکرت آمیز زبان استعمال کر رہا ہوں۔ایک جملہ اب تک ذہن میں محفوظ ہے۔سن لیجئے:

’’شانتا! تو پرم سندری اپسرا سدرشن کلپنا پورن ہے۔اس کی پراپتی کے لئے اتینت نتھا چنتاسن ہردے ہوں‘‘۔

رگھوویری ہندی والے پنڈت سے ہمکلام ہیں۔مولانا ابوالعلیٰ بغدادی۔سید ابونصران کا رول ادا کر رہے تھے۔اور ہم دونوں کی بات چیت میں حصہ لے رہے ہیں۔عبدالحمید انصاری جو مسٹر جان بنتے ہیں اور ہر جملہ میں نصف الفاظ انگریزی بولتے ہیں۔انگریزی اور ہندوستانی کی آدھی کھچڑی غلط املے والی زبان کے مقابلے میں منشی الفت رائے ہیں۔سید سلطان احمد منشی جی کے روپ میں صحیح، عام فہم، سیدھی اور سہل ہندوستانی زبان استعمال کر رہے ہیں۔وہی ڈرامہ کے مرکزی کردار ہیں جن کی زبان سب سمجھ رہے ہیں۔پانچواں کردار فاروقی ہیں، جو رام چپلوا کا کام انجام دے رہے ہیں۔کبھی مولانا بغدادی کا چلم تازہ کر رہے ہیں، کبھی پنڈت جی کو کھینی کے لئے چونا فراہم کر رہے ہیں۔کبھی مسٹر جان کے پائپ میں سلائی لگا رہے ہیں۔

ڈرامہ سے گھنٹہ بھر پیشتر اختر اور بینوی نے مجھے آواز دی اور کہا کہ سب کچھ تو ہو گیا مگر منشی الفت رائے کی چھڑی کا انتظام نہیں ہوا۔اب اس وقت کیا کیا جائے۔ میں نے ایک دعوتی کارڈ لفاف میں بھرا سیدھا سامنے کے محلّہ پیڑ بہوڑ کی طرف روانہ ہوا۔ایک صاحب چھڑی بردار نظر آئے۔جان نہ پہچان، جناب عالی سلام کیا۔مان نہ مان میں تیرا مہمان بنایا۔دعوت نامہ حوالے کیا۔عصائے پیری مستعار لے کر خود انکا سہارا بنا اور انہیں لا کر جمنازیم کی اگلی صفوں میں بیٹھا دیا۔اور اس طرح چھڑی کا انتظام ہوا۔
انجمن اسلامیہ ہال میں یوم غالب کے موقع پر بہار کے نوجوانوں کا مشاعرہ ہوا۔حلقہ ادب اور انجمن ترقی

پسند مصنفین والے مل جل کر اس تقریب میں شریک ہیں ۔اختر نے مکالمہ مرتب کیا، مواد فراہم کیا، کردار چنے اور ہدایت کی ۔پبلسٹی خوب ہوئی ۔ پوسٹروں میں یہ بھی درج ہوا کہ خواتین کے لیے پردہ کا خاص اہتمام رہے گا۔لوآخری وقت آپہنچا اور پتا چلا کہ چلمن کا بندوبست نہ ہوسکا۔اختر صاحب نے مجھ سے کہا۔ سعید اختر اور اسد حسین دوڑائے گئے ۔گول گھر کے پاس چلمن بنانے والے سے ملے ۔ناکامی ہوئی۔دونوں رکشے پر سوار اور پٹنہ سیٹی بازار حسن پہنچ گئے ۔وہاں بے پردہ چمن والیوں سے چلمن مستعار لیا اور پردہ نشین خواتین کے لیے پردہ کا اہتمام بھی ہوگیا۔اللہ اللہ کیا زمانہ تھا۔پٹنہ کالج کے سید نذرامام ہوں یا پٹنہ کالج کے قمر التوحید یا انجینئرنگ کالج کے محمد نسیم یا سائنس کالج کے جنید عالم یابی ۔این کالج کے ظفر محمود سب زندگی کے ڈرامے کے چلتے پھرتے کردار اسٹیج پر خود متحرک ہیں اور اسی طرح قوم وملت کے منجمد رگوں میں خون دوڑانے کی تگ و دو کررہے ہیں ۔آزادی کے فوراً بعد ہی کانگریس دوحصوں میں بٹ گئی اور سوشلسٹ پارٹی نے اپنی ڈفلی الگ بجائی ۔پٹنہ کے لان میں جو اس وقت گاندھی میدان ہے ،آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی سہ روزہ کانفرنس بڑے طمطراق سے ہوئی ،ادبی اور ثقافتی پروگرام بھی ہوئے ۔روحوں کا مشاعرہ بھی اسٹیج کرنے کا پروگرام بنا۔شری رام برکش بینی پوری نے اختر اورینوی کو اور اختر اورینوی نے مجھے پکڑا۔ہم نے میرؔ، داغؔ، غالبؔ، مومنؔ، حالیؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، نسیمؔ کی تلاش شروع کردی۔اس درمیان شری رام دھاری سنگھ دنکر کباب میں ہڈی بن کر داخل ہوئے ۔طے ہوا کہ کویوں کا بھی کوی سمیلن ہو۔بینی پوری سوشلسٹ مزاج رکھتے تھے ۔کہا دونوں ساتھ ہو۔مشترکہ مشاعرہ وکوی سمیلن منعقد کیا جائے ۔دنکر پر اس زمانے میں بھی ہندی امرت کا بھوت سوار تھا۔آبروئے ہندی کے لٹنے کے اندیشے نے انہیں اس تجویز پر رضامند نہ ہونے دیا۔طے ہوگیا کہ الگ الگ ہو۔وہ مصر رہے کہ پہلے ہندی والوں کا سمیلن ہوجائے پھر اردو کا فنکشن ہو۔ہم اس پر تیار نہ ہوئے ۔بینی پوری نے ہماری حمایت کی ۔پہلے روحوں کا مشاعرہ ہوا اور میرؔ سے لے کر شادؔ تک نے خوب خوب دادِ تحسین وصول کیا۔ملا جلا مجمع تھا۔ہزاروں سامعین تھے۔ پروگرام کامیاب رہا۔

پھر ڈھول آیا، مجرا باجا طبلہ لایا گیا، سارنگی لائی گئی اور کویوں کی گوشٹھی آرمبھ ہوئی ۔تار باجا اور راگ بوجھا۔ہم تو اخلاقاً بیٹھے رہ گئے ۔سامعین ایک ایک کرکے سب اٹھ گئے ۔ابھی پارلیا منٹ نے

ہندوستان کی سرکاری زبان کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔لیکن جنتا جناردھن نے اردو کی مقبولیت اور برتری پر اپنی قبولیت ثبت کردی تھی ....افسوس سیاست کی عینک نے اردو کو اس کے جائز حق سے محروم کردیا۔ آج بھی سیاست کی یہ پٹی آنکھوں پر سے اتار دی جائے تو یرقان کی بیماری دفع ہوجائے ۔اسی سیاست نے ہندوستان کے دوٹکڑے کردیے ۔تقسیم سے پہلے بہار میں فسادات ہوئے ۔شیوجی کی جٹا سے نکلنے گنگوتری سے پھوٹنے والوں، کوہساروں، مرغزاروں اور سبزہ زاروں سے لچکتی، پھسلتی، سرکتی، اور بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی گنگا ندی کا پانی صاف شفاف پوترا اور اجلا پانی سرخ ہوگیا ۔معصوموں، بیکسوں اور بے بسوں کے خون ناحق سے بہار کی سرزمین سیراب ہوگئی۔شہیدوں کا خون اس سرزمین میں جذب ہوگیا۔

جہاں مہاتما بدھ نے اہنسا کی تعلیم دی تھی ۔جہاں سمراٹ اشوک نے عدم تشدد کی مثال قائم کی تھی اور جہاں گاندھی جی نے اپنی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔مسلمان ہراساں پریشان کیے جانے لگے ۔وہ مایوس اور بددل ہوگئے ہمت ہارنے لگے۔ان کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ان کے دل بیٹھنے اور نبض ڈوبنے لگی ۔اختر اورینوی نے جلال الدین خوارزم شاہ کی بیوی کی جگہ دو بچوں نے لے لی۔مکالمہ تیار ہوگیا ۔اور ہم نے بینک روڈ میں یہ ڈرامہ اسٹیج کیا۔مسلمان بھاری تعداد میں آئے ۔اس ڈرامہ سے ان کی ہمت بندھی ۔ان کا Moral سدھرا۔وہ ٹھٹکے اور ٹھہر گئے ۔بھگدڑ رکی اور مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ڈرامہ کا آغاز علامہ اقبال کے فارسی کلام سے ہوا۔

''از خواب گراں ،خواب گراں، خواب گراں خیز''
''گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے جاگو''

میں نے بآواز بلند اسے پردہ کے پیچھے سے مؤثر انداز میں پڑھا۔ڈراپ سین کے بعد پس منظر سے شاعر اعظم مشرق کی نظم کورس میں پڑھی گئی۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

سیاست بھی عجیب چیز ہے ۔دلوں کو جوڑتی بھی ہے ۔چاہے تو دو قوموں کو ایک کردے اور نہ چاہے تو ایک قوم کے دوٹکڑے ہوجائیں۔

بات پر بات نکلی آ رہی ہے ۔قوموں اور ٹکڑوں کا ذکر آ گیا تو ایک واقعہ اور درج کر دوں ۔ فسادات بہار رنگ لا کر رہے گا ۔خون شہیداں رائیگاں نہ گیا ۔ ملک کی تقسیم کی بنیاد پڑ گئی ۔نفرت کی دیوار کھڑی ہوگئی ۔فرنگیوں کی چال کامیاب ہوگئی ۔ اس نے ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کر دی ۔بعض علاقوں میں ریفرنڈم اور رائے شماری کا فیصلہ ہوا ۔آسام میں ریفرنڈم کا اعلان ہوا ۔استاد نے کہا ۔یہ وقت یہاں بیٹھے رہنے کا نہیں ۔ چند شاگردان رشید نے کمبل کاندھے پر ڈال سلہٹ کا رخ کیا ۔ نہ گھر پر خبر کی ۔ نہ تیاری کرنی پڑی ۔استاد کے دل وجگر میں ملت کا درد تھا ۔شاگردوں کے سینے میں جذبہ قومی موجزن تھا ۔ ارشاد کی دیر تھی ۔تعمیل میں تاخیر نہ ہوئی ان لوگوں نے کتنے پالے مارے تھے یہ پلہ بھی انہیں کے حق میں رہا ۔ ہندوستان کا مسلمان پاکستان کے سوا اور کچھ نہ سوچتا تھا ۔اس نے پاکستان بنا کر چھوڑا ۔ ہندوستان اور پاکستان کے بعد کتنے سانپوں نے کینچلیاں بدلیں ۔ کتنے گرگٹوں نے رنگ بدلے کتنے انسانوں نے ٹوپی بدل لی ۔ دنیا ہی بدل گئی ۔ نہ پاکستان خوابوں کا وہ ارض پاک ہی رہ گیا اور نہ ہندوستان رشیوں اور صوفیوں کی دھرتی رہ گئی ۔ پاکستان سے پاکستان کیسے نمٹے وہ جانیں ۔ ہاں ہمیں یہاں عزیز مصر ، ہوس اقتدار کی زلیخاؤں ، چاہ کنعان ، بازار مصر میں برادران یوسف سے جس طرح نپٹنا پڑا ہے وہ ہمیں جانتے ہیں ۔

آزادی تو مل گئی ۔ ہندوستان اور پاکستان بھی بن گیا ۔ ہندوستان میں کروڑوں مسلمان رہ گئے ۔ کسی نے دن کی روشنی میں ترنگے جھنڈے کو سلامی دی اور راتوں رات بستر لپیٹ کر صبح کی خاموشی میں پاکستان فرار ہوگئے ۔ کسی نے گاندھی جی کے دست ہائے دراز کا سہارا ڈھونڈا ۔ کوئی جواہر لال کے بیداغ سفید اچکن کے دامن میں پناہ لینے کو دبک بیٹھے اور کوئی چپ چاپ اپنے گھر پر کھاٹ بچھا کر لیٹ رہا ۔لیکن اس بظاہر مایوس کن ماحول میں بھی امید کی چنگاری جگنو بن کر اڑتی رہی اور راہ بھولے ہوئے کو اندھیاری بھادوں کی رات کی بجلی کی چمک کی طرح راہ دکھاتی رہی ۔ میں نے ''نوجوان'' کا ''ہم کیا کریں نمبر'' اسی اندھیرے میں راہ ٹٹولتے ہوئے شائع کیا ۔

میں خود سر ضیاء الدین سے ملا ۔نواب محمد اسماعیل خان سے ملاقات کی ۔ڈاکٹر ذاکر حسین خان سے تبادلہ خیال کیا ۔حسین سہروردی اور محمد اسماعیل سید سے ملاقات کی ۔اسی مدت میں اختر اور ینوی کا دل مضطرب قرار نہ پا سکا ۔جب ان کے ڈیرے پر جاؤ تو معلوم ہوگا باہر گئے ہیں ۔ واپس آئے تو پتہ چلا کہ زیڈ

.ایچ لاری کے مسلم کنونشن میں شریک ہونے گئے تھے ۔محمد اسماعیل ،خلیق الزماں ، لاری ، سہروردی اور آزاد نے اسی غرض سے اجتماعات بلائے کہ ہندوستان کے مسلمان بدلے ہوئے حالات پر کیا لائحہ عمل اور راہ عمل اختیار کریں ۔ ہندوستان کا مسلمان روشنی کی اس کرن کی تلاش میں مدراس سے کلکتہ اور کلکتہ سے لکھنؤ مارا مارا پھر رہا تھا جس سے اسے منزل مقصود کو جانے والا راستہ صاف نظر آئے ۔ اختر اور ینوی ان بیشتر اجتماعات میں خود شریک ہوئے ۔ان کی حیثیت یہاں قائد کی نہ تھی ، بلکہ وہ خود قائد دیگر کی جستجو میں سرگرداں تھے ۔اب کیا ہوگا ؟ یہی سوال تھا جو سر اختر میں سودا بن کر بس گیا تھا ۔

یہ سوال سب سے زیادہ کب ابھرا ۔اس کی صرف ایک مثال آپ کے سامنے رکھوں گا ۔۳۰؍ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام ہے ۔ میں ، اشرف محمد ، ڈاکٹر منصور ، ڈاکٹر سعید احمد عزیز اور سید ابوجعفر (ان میں سے میرے علاوہ باقی سب اس وقت پاکستان میں ہیں) انجمن اسلامیہ کی دوسری منزل پر اس کمرے میں بیٹھے ہیں جو اس وقت انجمن ترقی اردو کا دفتر ہے اور جو اس وقت بہار صوبائی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا دفتر تھا ۔اور انجمن یہ انجمن اسٹوڈنٹ فیڈریشن سے حلقہ احباب نوجوان ، پھر حلقہ ادب بہار اور پھر نوجوان اور انجمن ترقی اردو کے دفتر میں منتقل ہوتا رہا ۔زبیر ملک جو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری تھے اور ان دنوں پاکستان میں ہیں ۔ مجسٹک ہوٹل میں چائے پینے گئے ہیں ۔ ہوٹل وہیں تھا جہاں اب انجمن اسلامیہ کے پاس قبرستان ہے ۔ وہ مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کی آماجگاہ تھا ۔ نہ جانے کتنی یادیں اپنے ساتھ لئے مجسٹک ہوٹل زمین کے برابر ہوگیا ۔ زبیر دوڑے ہوئے اور ہانپتے ہوئے دفتر میں آئے اور خبر سنائی کے گاندھی جی مار دیئے گئے ۔ ہمارے بدن میں تو جیسے کاٹو تو لہو نہیں نہیں ۔ دماغ سن سا ہوگیا ۔ میں اٹھا سائیکل اٹھائی اور سیدھا مسلم ہوسٹل پہنچا جو آجکل اقبال ہوسٹل ہے ۔ میں بی ۔اے ۔میں انگریزی آنرز کا اسٹوڈنٹ تھا ۔مسلم ہوٹل کے کمرہ نمبر ۵۶ میں رہتا تھا ۔اختر اور ینوی ہمارے ہاسٹل سپر نٹنڈنٹ تھے ۔ پچاس سے اوپر مسلمان لڑکے اور بیس سے اوپر ہندو لڑکے اس ہاسٹل میں رہتے تھے ۔ ہاسٹل پہنچا تو دیکھا کہ ہاسٹل کے میدان میں لڑکے کھڑے دعائیں مانگ رہے ہیں :

''ہے ایشور ، ہے خدا ، ہے پرماتما ، یا اللہ یا God یا معبود حقیقی ہم پر رحم کر ۔ ہمارے ملک کو آفت سے بچا........''

ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ ''کہیں مسلمان نے تو نہ مار دیا''۔ اور اگر ایسا ہوا ہے تو ان کروڑوں مسلمانوں کا کیا ہوگا ؟ اب کیا ہوگا''۔ اختر اور ینوی گھنٹہ بھر رقت بھری آواز سے یہی دعائیں مانگتے رہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جسم پر لرزہ طاری تھا اور زبان پر دعائیہ کلمے جاری تھے۔ پنڈت نہرو نے شاعری کی ''ایک پاگل انسان نے باپو کو مار دیا''۔ سب سے پہلے بی بی سی لندن فوراً ہی بعد ریڈیو پاکستان اور بعد میں ہندوستان میں سب سے پہلے سردار پٹیل نے یہ خبر سنائی کہ گولی مارنے والا نتھو رام گوڈسے تھا۔ ایک ہندو تھا، مسلمان نہ تھا۔ گاندھی جی کے بارے میں مارے جانے کا گھاؤ تو رہ گیا لیکن دماغی کھچاؤ کی جو کیفیت تھی وہ جاتی رہی۔ قدرے سکون ہوا۔ جان میں جان آگئی۔ اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔ اب سانس اوپر نیچے چلنے لگی۔ اختر صاحب کوارٹر میں آگئے۔ وہ مسلم ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور سپرانٹنیٹ کوارٹر ہوسٹل سے متصل ہے۔

ہاسٹل سپرنٹنڈنٹ کی بات آگئی تو ایک واقعہ سنا دوں۔ اختر صاحب ان لوگوں میں نہ تھے جو خواہ مخواہ رعب جماتے ہوں۔ اختر صاحب کا جو اثر بورڈرس پر تھا اور لڑکے ان کی قدر کرتے تھے وہ کالج کے کم ہی اساتذہ کو نصیب تھی۔ ہاں جو ''رعب'' اور ''داب'' کا تصور ہے وہ ان کے ساتھ نہ تھا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ہاسٹل کے نئے لڑکوں پر تو ہوسٹل کے چیف وارڈ چھکومیاں کا رعب زیادہ تھا۔ میں ایک بار کسی قومی کام سے باہر گیا۔ دورے سے ہفتے کے بعد لوٹا۔ غلطی سے کمرے کی لائٹ آف نہیں کر کے گیا تھا۔ چنانچہ روشنی جلتی رہی۔ بغیر اجازت بلکہ بلا اطلاع گیا تھا۔ واپسی پر جب سپرنٹنڈنٹ صاحب سے سامنا ہوا تو کہنے لگے۔ ''بھائی بتی تو گل کر کے جایا کریں اگر کہیں جائیں تو''۔ ان سب سے اپنائیت محسوس کرتے، چاہے وہ لڑکے ہوں۔ سینئر یا جونیئر یا پھر ملازم ہوں یا جی حضور کہنے والے اصغر ہو جو ہمیں ناشتہ کراتا۔ وہ اس وقت بھی مسلم ہاسٹل کے ناشتہ کا ٹھیکہ دار تھا۔ جب اختر صاحب بورڈر تھے۔ پھر اسی زمانے میں بھی رہا جب وہ سپرنٹنڈنٹ ہوئے اور شاید اب بھی ہے، جب مسلم ہاسٹل اقبال ہاسٹل ہو گیا اور نہ معلوم کب تک رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ سب کے سب ان سے مانوس تھے۔ انہیں اپنا سمجھتے تھے۔

جب تمام باتیں ہو رہی ہیں تو میں وہ یہ واقعہ بھی کیوں نہ درج کر دوں جب میرے اور اختر صاحب کے تعلقات کی ریشمی ڈوری ٹوٹ گئی تھی۔ شیشہ میں بال آ گیا تھا۔ تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔

میں اردو ایم۔اے۔ کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اختر صاحب میرے استاد تھے۔ حافظ شمس منیری صدر شعبۂ اردو تھے۔ علامہ جمیل مظہری اور پروفیسر صدرالدین فضا میرے استاد تھے۔ اس وقت پارٹ ون اور پارٹ ٹو کا امتحان الگ الگ ہوتا تھا۔ کالج کی پوری تعلیم تو میری قومی ملی ہنگامی سرگرمیوں میں گزر گئی اور رزلٹ خاطر خواہ نہ کر سکا۔ سوچا اردو زبان ادب سے شروع سے خاص شغف رہا ہے۔ چند مہینہ جی لگا کر پڑھوں تاکہ یہ آخری زینہ بہ طریق احسن طے کر سکوں۔ تین مہینے محنت کر کے تیاری کی۔ امتحان دیا۔ رزلٹ سے ایک دن پیشتر پتہ چلا کہ میں سیکنڈ ہو گیا اور شمیم آراء رحمٰن اول آئیں۔ محض چار نمبر کا فرق۔ بس میں علی الصبح سارنگ دھر سنگھ کے پاس تحریری شکایت لے کر پہنچا۔ وہ وائس چانسلر تھے۔ ہنگامہ ہو گیا رزلٹ رک گیا اور یہیں میرے اور اختر صاحب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ یونیورسٹی چھوڑنے کی بات آ گئی۔ کلیم الدین احمد جو وارڈن تھے، ان سے شکایت کی گئی اور یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ انجام کار کلیم صاحب اور حافظ شمس الدین صاحب کی حکم کی تعمیل میں، میں ٹھہر گیا اور پارٹ ٹو کے کلاس کرنے لگا۔ اختر صاحب کا کلاس ہوتا تو ہم دونوں خاموش بیٹھے رہتے۔ مہینوں بعد آخر یہ سلسلہ ٹوٹا۔ مستقل دو گھنٹے میں اور اختر صاحب کلاس روم میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے ۔ ان کے کواثر گیا اور سارا میل دھل گیا۔ شکیلہ اختر بھی مجھے جانتی مانتی اور چاہتی تھیں۔ ہم بھی بھول گئے کہ کبھی کچھ ہوا تھا۔ اختر صاحب پھر اسی طرح ایک شفیق استاد اور رفیق ہو گئے۔ میں پھر ایک سعادت مند طالب علم اور حکم کا بندہ ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے پھر کبھی اختر صاحب نے اور میں نے دل میں بات نہ لائی۔ اختر صاحب کا یہ بڑا پن ہے۔ اور بلاشبہ انہوں نے انسانی عظمت کا عملی ثبوت گزرے ہوئے برسوں میں پیش کیا۔ اختر اور ینوی سے آپ کو مذہبی، سیاسی، نظریاتی، فکری اور ادبی اختلاف ہو سکتا ہے، مگر وہ بات چیت میں ملنے جلنے میں، بات اخلاق میں ہرگز ان اختلافات کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔

لوگ کہتے ہیں اختر صاحب قادیانی ہیں اور اپنے اسٹوڈنٹس پر قادیانیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میں دس سال تک اختر صاحب کی رگ جان کے قریب رہا ہوں۔ میں یا میرے کسی ساتھی کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوئی کہ اختر صاحب اپنا عقیدہ کسی پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک عقیدہ ہے ہم اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر بھی زبان، ادب، قوم و ملت اور سماج کی سطح پر ہم جس طرح ان کی رہنمائی میں ان کے ساتھ،

اور کبھی ان کو ساتھ لے کر آج کا کام کرتے ہیں۔اسی کا اصلی نام جذباتی ہم آہنگی ہے۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ پروفیسر اختر اورینوی، فضل احمد ایس. پی. اور ڈاکٹر منصور جس طرح کے قادیانی ہیں اور اپنی آمدنی کا جو حصہ وہ اپنے مسلک کی خاطر ماہانہ وقف کرتے ہیں۔کاش ہم قادیانیوں پر لعن طعن کرنے کے بجائے اپنے عقیدہ کے ویسے ہی پکے مسلمان ہو جائیں اور ہر ممکن جانی مالی ایثار وقربانی کے لئے تیار ہو جائیں تو آج ہمارے یہ سارے قومی ملی مسئلے یکسر حل ہو جائیں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی بقول شاعر

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تیری جوانی تک

حالانکہ یہاں معاملہ الٹا ہے یعنی ذکر چھڑا اختر کی جوانی کا........اور بات پہنچی آج کی قیامت سامانی تک، کاش ہم آپ بھی سمجھ سکیں کہ یک لحظہ غافل کا مطلب صد سالہ راہم دور شد ہوتا ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

اختر صاحب ادیب ہیں کیسے ہیں؟ مقرر کیسے ہیں؟ افسانہ افسانہ نگار کیسے ہیں؟ اور شاعر کیسے ہیں؟ دوسرے سے سنیے۔ہم نے جو قوس قزح اس وقت آپ کے سامنے رکھی اس کے سات رنگ آپ دیکھ چکے۔ وہ پروڈیوسر، ڈائرکٹر ہیں۔ان میں لیڈرشپ کی صلاحیت ہے۔ وہ اردو کے رسیا ہیں۔ایک شریف وخلیق انسان ہیں۔ایک فاضل اور شفیق استاد ہیں۔ایک دردمند دل والے ہیں اور اپنے عقیدے میں پختہ ایک قادیانی ہیں۔میرا مقصد یہی تھا کہ یہ دھنک آپ کو دکھاؤں اور آپ دیکھ لیجئے۔

(ماہنامہ ''ساغرنو'' پٹنہ کے اختر اورینوی نمبر میں شایع ہوا)

منتخب تحریریں (۲)

مواد اور ہیئت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مواد، اسلوب، تکنیک اور ہیئت کیا چیزیں ہیں ؟ ادب سے ان کا کیا تعلق ہے اور فن کار انہیں کس طور پر استعمال کرتا ہے پھر ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے ؟ ان سوالوں کا جواب آج سے صدیوں قبل بھی دیا گیا ہے اور ان کے رشتے کو واضح کیا گیا ہے۔

معنی، خیال، تجربہ، واقعہ، حقیقت، مواد کے مختلف نام ہیں اور لفظ، اسلوب، تکنیک، صورت اور ہیئت ان ہی معنوں، خیالات، تجربات، واقعات اور حقائق کو بیان کرنے کے طریقے، ڈھنگ اور بیان کی گئی باتوں کی مختلف شکلیں ہیں ایک طبقہ ایسا ہے، جو صرف لفظ اور کہنے کے طریقے کو اہم ترین تصور کرتا ہے اور ''کیا کہا گیا'' کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔اگلے لوگوں میں قدامہ اور ابن خلدون اس گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔قدامہ اپنی تصنیف ''نقدالشعر'' میں فرماتے ہیں:

''شعر ایک قول موزوں ومقفیٰ ہے، جو کسی معنی پر دلالت کرتا ہو، موضوع شعر اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، اس کا اعلیٰ طور پر ادا ہو جانا ہی شاعری کا کمال ہے۔''

ان کے خیال میں یہی صناعی کمالِ فن ہے۔اپنے اس بیان کے ثبوت کے طور پر وہ بڑھئی اور سنار کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔اگر بڑھئی اور سنار ہنرمند ہیں تو انہیں لکڑی یا سونا اچھا ملے یا خراب، اس سے وہ نفیس ترین اشیاء تیار کر سکتے ہیں، جو حسن اور نفاست میں اپنی مثال آپ ہوں۔ابن خلدون بھی حامی بھرتے ہیں:

''انشاپردازی کا ہنر خواہ وہ شاعری میں ہو، یا نثر میں، محض الفاظ میں ہے، معنی میں مطلق نہیں۔ اصل الفاظ ہیں، معنی تو الفاظ کی تابعداری کرتے ہیں۔معنی کے لئے کسی فنکاری کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ

پہلے سے موجود ہوتے ہیں فن کاری وہاں درکار ہے کہ معنی کو کس طرح الفاظ میں ادا کریں۔''

وہ بھی اس بیان کی تائید میں پیالہ اور پانی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ الفاظ گویا پیالے ہیں اور معنی پانی۔ پانی بہرحال پانی ہے۔ البتہ پیالہ جتنا نفیس ہوگا، پانی کی وقعت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ آج حسن عسکری اسی خیال کا پرچار کرتے ہیں اور صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں کہ:

''ہیئت ہی کل آرٹ ہے اور ہیئت ہی فن کار کی حقیقت ہے۔ ہیئت کی تلاش ایک اخلاقی جدو جہد ہے۔ خود زندگی کی تلاش ہے۔''

ایک دوسرا گروہ ہے، جو لفظ کی اہمیت کا یکسر معترف نہیں، بلکہ صرف خیال کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اردو کے جدید دور کے پہلے حصے کے ناقدوں میں اختر حسین رائے پوری اس خیال کے پیش رو ہیں۔ وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں:

''چونکہ میں اظہارِ جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا، اس لئے پہلے دیکھتا ہوں کہ شاعر کیا کہتا ہے۔ کیسے کہنے کا سوال بعد میں آتا ہے۔''

اس لیے وہ ہندوستانی ادب کا ''معاشی تجزیہ'' کرتے ہیں۔ فنی تجزیہ کا سوال اتنا بعد میں آتا ہے کہ تمام مضامین میں کہیں فنی تجزیہ نہیں ملتا۔ یوں یہ سمجھ لیجیے کہ ''کیسے کہنے کا سوال'' ان کے یہاں آتا ہی نہیں۔ جدید ترین ناقدوں میں سید احتشام حسین کا یہ خیال ہے۔ گویا وہ شاعری کی تعریف ایک جگہ یوں کرتے ہیں:

''ایک خیال کو جو کسی مادی تجربہ پر مبنی ہو، شدت احساس اور مخصوص فنی طریقہ اظہار کی پیچیدگی کے ساتھ پیش کرنا شاعری کہلاتا ہے۔''

اور مواد اور ہیئت کے تعلق کا احساس بھی انہیں ہے۔ چنانچہ یہ کہتے ہیں: ''مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے، اسی کی آمیزش سے ادب بنتا ہے۔'' دراصل ہیئت ہی ان کے نزدیک کوئی الگ سی چیز نہیں، لہٰذا وہ کہتے ہیں:

''انقلاب اور تغیر کے زمانے میں اسلوب مواد کا پابند ہوتا ہے، جمود اور انحطاط کے زمانے میں اظہار ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ اظہار دونوں حالتوں میں سماجی عمل ہے اور سماج کی خواہشات کا پابند......''

اس لئے وہ ایک جگہ ظاہر کر دیتے ہیں:

''ہر حال میں خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے۔ ترقی پسند ادیب کبھی بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوسکتے۔

یہی سبب ہے کہ جب کوئی فراقؔ، کوئی جگرؔ، کوئی فانیؔ، کوئی میرؔ، کوئی حسرتؔ، خیال کی تنہائیوں میں ان کا تعاقب کرتا ہے اور ان کے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے لگتا ہے، تو وہ ایک ادب نواز ہونے کے ناطے بے قابو ہوجاتے ہیں، مگر ایک ناقد کی حیثیت سے اس کی بے تابی کا جواز نہیں بتلا سکتے۔

ان دونوں گروہوں سے الگ تھلگ ایک سوال اسکول ایسا بھی ہے، جو ایک انوکھا اور منفرد تصور پیش کرتا ہے۔ اس اسکول کا علمبردار کروچے ہے۔ بقول کروچے ''وجدان کے اندرونی افعال ہی دراصل فن ہیں۔'' فن محض وجدان یعنی ذہن یعنی اثرات کے اظہار کو کہتے ہیں جب یہ احساس باطن ظاہری شکل اختیار کر لے تو پھر وہ آرٹ نہیں رہتا۔ اخلاق اور قانون کی پابندی اس پر لازمی آتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو لفظ اور معنی دونوں کی اہمیت سے منکر نہیں۔ ہاں کوئی ایک پر زیادہ زور دیتا ہے اور کوئی دوسرے پر۔ شبلیؔ حالیؔ اور عبدالحق ان لوگوں میں سے ہیں، جو لفظ پر زیادہ زور دیتے ہیں، مگر معنی کو نظر انداز نہیں کرتے، شبلیؔ کہتے ہیں:

''شاعری کے دو جز و ہیں، مادہ اور صورت۔ ان ہی دونوں جزؤوں کے مجموعے کا نام شاعری ہے۔''

وہ اس ''مجموعے'' کی کوئی خاص وضاحت نہیں کرتے، مگر بعد میں یا جہاں کہیں بھی بحث کرتے ہیں فصاحت، راگ، الفاظ، لئے، ردیف، قافیہ، تال، سر، بلاغت، استعارہ، تشبیہ اور مصوری ہی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حالیؔ صرف ایک جگہ یہ جملہ ضرور لکھتے ہیں کہ ''خیال بغیر مادہ کے پیدا نہیں ہوتا'' مگر شبلی کی طرح وہ بھی اس جملے کی تشریح کہیں نہیں کرتے اور ہمیشہ ''لفظ اور معنی'' کو الگ الگ استعمال کرتے ہیں اور ایک مطلب کو مختلف اسلوبوں میں بیان کئے جانے کے بھی قائل ہیں سید احتشام حسین بھی ٹھیک وہی کرتے ہیں، جو حالیؔ کرتے ہیں۔ حالیؔ کا حوالہ دیتے ہوئے وہ یہ جملہ دہراتے ہیں کہ:

''خیال بغیر مادہ کے پیدا نہیں ہوتا''

مگر خود ہی وہ خیال کی مخصوص گروہ بندی بھی کر دیتے ہیں اور خیال اور لفظ کی آمیزش کو بھول کر

ہر حال میں لفظوں سے زیادہ اہم بتانے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق کے لئے خیال کی جگہ ضرور ہے، مگر وہ لفظ کی قوت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ان لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں جو مواد اور صورت کے مجموعے کے قائل ضرور ہیں، مگر زیادہ زور مواد پر دیتے ہیں۔ مواد کے معاملے میں اختر اور احتشام کے مانند بھی معاشی اور تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہیں، مگر اسلوب کے بیان میں دونوں حضرات سے الگ اس خیال کے حامی ہیں کہ:

''صورت اور اصلوب کو ادیب کی انفرادیت (جو کچھ) مہیا کرتی ہے اور وہ ادب کے جمالیاتی عنصر ہوتے ہیں۔''

احتشام کے قریب جاتے ہوئے بھی وہ دور ہو جاتے ہیں:

''کہا جا سکتا ہے کہ ادیب کی انفرادیت خود معاشرتی حالات اور اجتماعی میلانات کی ساختہ و پرداختہ ہوتی ہے۔ سچ ہے لیکن پھر یہ انفرادیت، معاشرت اور ہیئت اجتماعی پر بھی اپنا اثر ڈالتی ہے۔''

اس گروہ سے ایک قدم آگے معمارانِ ادب کا وہ طبقہ ہے، جو سنگ مرمر اور سنگ سرخ سے بنے ہوئے تاج محل اور لال قلعہ جیسے حسین اور پائدار نقش فن کا مداح ہے۔ یہ طبقہ تیل اور پانی کے ملاپ کا قائل نہیں، چولی اور دامن کے ساتھ کو سراہتا ہے۔ جب قدیم رومی نے یہ کہا تھا

شعر می گویم بہ از قند و نبات
من ندانم فاعلاتن فاعلات

تو اس کے یہی معنی تھے۔ آج آل احمد سرور، رومی کے اسی خیال کی پیروی کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''صرف اسلوب سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ کہنا بے موقع ہے کہ ایسا خیال پرانے طریقے سے بھی ادا ہو سکتا تھا۔''

اسی خیال کو عملی طور پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ''مشینی اشعار'' ڈھال کر ثابت بھی کر دیا ہے۔ سرور مواد کو زندگی سے مستحکم اور گہرا تعلق ہونا ضروری قرار دیتے اور اسلوب میں تلوار کی تیزی بہتے ہوئے دریا کی روانی، آئینہ کی صفائی اور ادائے محبوب کی دلربائی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس سے زیادہ Tight خیال

ہمیں ''**کتاب العمدہ**'' **باب فی اللفظ و المعنی** کے ان جملوں میں ملتا ہے:

''لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے۔ دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا جسم اور روح کا ارتباط، کہ وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی۔''

''**کتاب العمدہ**'' کے اس خیال کی ترویج کلیم الدین احمد کرتے ہیں:

''اور اس حقیقت پر زور دینے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ مواد اور صورت میں ناگزیر ربط ہے۔ ہر مواد کی نوعیت صورت کا فطری انتخاب کرتی ہے۔ مواد اور اسلوب کا تعلق جسم اور کپڑے کا نہیں، بلکہ جسد اور روح کا ہے۔''

''ممتاز شیریں نے عملی طور پر خیال کو اپنے مضمون 'تکنیک کا تنوع' میں افسانوں کا جائزہ لے کر پیش کیا اور مثالوں سے بھی ثابت کیا ہے:

''کوئی برتن بنانا ہو تو مٹی چاہئے۔ یہ خام مواد ہوا۔ پھر اس میں رنگ ملایا جائے گا۔ یہ اسلوب تحریر ہے۔ پھر کاریگر اسے اچھی طرح گوندھ کر اُسے توڑتا، مڑوڑتا، کہیں دباتا، کہیں کھینچتا، کسی حصہ کو گول، کسی کو چوکور، کہیں لمبا، کہیں گہرا، ایک مخصوص شکل کے آنے تک اسی طرح ڈھالتا جاتا ہے۔ تکنیک کے لیے یہ ایک موٹی تشبیہ ہے اور آخر میں جو شکل نکل آتی ہے وہ ہیئت ہوئی اور جو چیز بنتی ہے وہ افسانہ۔ فرق یہ ہے کہ ہیئت مکمل شکل (Finished Form) ہے اور افسانہ مکمل چیز (Finished Product)

دراصل یہی حسین امتزاج اور یہی متوازن، متناسب، بہتر اعلیٰ، پائیدار اور عالمگیر ادب کی جان ہے۔ ایک ہنرمند بڑھئی ایک کمزور اور گھن کھائی دیوار کی لکڑی سے ایک بظاہر حسین پلنگ تو تیار کر سکتا ہے مگر اس پلنگ میں شیشم، ساگوان اور املی کی لکڑیوں کی پائیداری اور مضبوطی کہاں ؟ ایک ہنرمند سنار بھلے ہی خام دھات سے حسین زیور تیار کر دے، جس میں سونے سے زیادہ چمک ہو، اور وہ زیور دلی کی گلیوں میں ''حسن پرست'' اور ''مست قلندر'' میں چھپے اشتہاروں کی بدولت تین روپے فی تولہ کے حساب سے فروخت ہوا کرتا ہو۔ مگر وہ ہمیشہ جھوٹا ثابت ہوا ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ چمک دار سونا سیاہ رنگ اختیار کر لیتا ہے،، پھر بھی جھوٹا ثابت کرنے والے کو آج تک ایک ہزار روپیہ نقد انعام نہ مل سکا ہے۔ پانی ایک سونے کے جام میں بھی پانی ہے اور مٹی کے کوزے میں بھی پانی ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو نظر

انداز کرنا بھی ناممکن ہے کہ ٹھرا جام جم میں بھی ٹھرا ہی ہے اور شراب ارغواں چاہے جام سفال ہی کیوں نہ رکھیں، اسے شراب ارغواں ہی کہیں گے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ شرابِ ارغواں کے لئے جامِ جم اور ٹھرا کے لئے جام سفال ہی موزوں برتن ہیں۔ فنکار کے لیے، خواہ وہ بڑھئی ہو، سنار، سنگ تراش، مصور، کمہار یا ادیب جو کچھ بھی ہو، اس کا مواد اعلیٰ ہونا لازمی ہے۔ پھر اس مواد کے لئے مختلف متناسب رنگ اور فن کاری سبھی کچھ درکار ہے۔ ایک چیز کی کمی ہوگی، تو پوری چیز کسی نہ کسی اعتبار سے کمزور ضرور ہوگی۔ فن، فکر اور فارم میں مکمل توازن اور ہم آہنگی ضروری ہے۔ جس طرح کسی مضبوط لکڑی کے بکس لئے املی کی لکڑی درکار ہے، نفیس اور نازک تپائیوں کے لئے دیودار اور حسین مگر پائیدار اور مستحکم، ہلکے پھلکے کوشن سیٹ کے لئے شیشم کی لکڑی اور پھر ان کی الگ علیحدہ اور مختلف تراش خراش اور بناوٹ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر مواد اور موضوع کا ایک الگ اور علیحدہ اسلوب ہوگا۔ الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب الگ منزلیں نہیں، بلکہ خیال، فکر یا موادفن کار کے لیے شدتِ احساس اور جذبات کو خود بخود دایڑ لگاتے ہیں اور پھر فن کار پر جیسے فارم کی وحی نازل ہونے لگتی ہے اسے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ ہی اسے نئے اور پرانے کی تمیز کرنی پڑتی ہے۔ شاعروں کی موزونی طبع سے یہی مراد ہے۔ نئے سفر کے لیے پرانے چراغ کا گل کرنا اتنا ضروری نہیں جتنا نئے جنون کے لیے نیا ویرانہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیانہ کسی شاخ گل پہ بار نہ ہو
(دانشؔ)

میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے
(فیضؔ)

یہاں وہی پرانے چراغ ہیں۔ آشیاں، شاخِ گل، میخانہ، سرخیٔ مے، در و بام حرم، مگر انہیں گل کرنے کی بجائے ایک نئی عمارت بخشی گئی ہے، جہاں وہ تابندہ ہیں۔ اسی لئے یہ اشعار فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں، نہ کہ زندگی کے ٹھوس حقائق کی یہ حقیقت بیانی :

چوم ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوا
یالو وہ تلوار چلی اور زمیں کا سینہ
ایک لمحہ کے لئے چشمہ کی مانند بنا
(میراجیؔ)

دراصل بقول فیضؔ، شاعر اپنے تجربات کے اظہار میں بعض الفاظ کو اصطلاحات قرار دے لیتا ہے۔ شاعر اور اس کے سننے والوں کے درمیان تقسیم کی مفاہمت ہو جاتی ہے۔ شاعر جب سفاک کہتا ہے تو اس کی مراد چنگیز خاں سے نہیں ہوتی، اپنے محبوب سے ہوتی ہے۔

Dryden نے Annus Mirabilis کے تعارف میں شاعر کے تخیل کے تین منازل بتائے ہیں۔ احساس، تصور اور اظہار۔ احساس میں پھرتی تصور میں زرخیزی اور اظہار میں صحت، یہی ہیں ایک بڑے شاعر کی میراث:

کشش بدر سے چڑھتا ہوا دریا دیکھا
اللہ اللہ رے عالم تری انگڑائی کا
(پریم پجاری)

عزیزؔ احمد حقیقت نگار کے موضوع اور اسلوب میں جو پوری مناسبت چاہتے ہیں، وہ انہیں اس شعر میں مل جائے گا۔ کشش بدر سے دریا کا چڑھنا ایک سائنسی حقیقت ہے، تو تجربہ کے طور پر شاعر کے ذہن میں اُس وقت محفوظ ہو گیا تھا جب وہ اسکول میں ساتویں یا آٹھویں درجہ کا متعلم تھا اور جغرافیہ کے استاد نے اس حقیقت سے باخبر کیا تھا۔ وہی تجربہ اسے آج دستیاب ہوا ہے۔ دراصل یہی دستیابی شاعری یا ادب یا فن کی جان ہے۔ بیشتر ایک بڑی اور معمولی شاعری یا عامیانہ اور حقیقی تجربہ میں فرق شاعر کی رمزیت، استعارہ اور تصویریت کے استعمال کے باعث ہوتی ہے۔ ایا وہ ذاتی ہے، کمزور ہے، جدید ہے، پرانی ہے، شدید ہے یا پر جوش ہے۔ ایک فن کار اور عامی میں احساس کا فرق ہے۔ ایک بڑا فن کار فطری طور پر ذکی الحس ہوتا ہے۔ اس کے تخیل میں بلند پروازی ہوتی ہے، مگر توازن کے ساتھ۔ اس خیالات میں صداقت اور خلوص کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ وہ ان خیالات کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور پھر اپنی

قادرالکلامی کے سبب اسے اپنے فن کے ذریعہ حیاتِ جاوداں بخشتا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی موضوع حقیقی ہے اور دوسرا فرضی۔ سوال اس کا ہے کہ اس کے اظہار میں احساس کی شدت ہے یا نہیں؟ اگر اسلوب میں صحت اور حسن ہو، مگر خیالات تندرست اور حسین نہیں، تو پھر وہ لفظی شعبدہ بازی اور بازی گری ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی اچھے ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ ''مجنوں کی ڈائری'' والے عبدالغفار اور ''لیلیٰ کے خطوط'' والے قاضی عبدالغفار میں اسی شدت احساس اور موضوع کی زندگی کا فرق ہے۔ اگر تجربہ حقیقی ہے تو ''چڑے چڑیا کی کہانی'' کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزادؔ کی رنگین بیانی بھی سنگین حقیقت کو ایک مجرم کی اس حقیقت بیانی سے مختلف کر دیتی ہے، جو وہ حاکم کے سامنے کٹہرے میں کھڑے ہو کر بیان کر دیتا ہے۔ تجربات کی دستیابی اور ان تجربات کے لیے مناسب اسلوب کا استعمال ہی بڑے فن کار کے لیے لازمی جزو ہیں۔ الفاظ کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ جب فن کار کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو قاری کے ذہن پر پہلے اس لفظ کا ظاہری اثر ہوتا ہے۔ جب وہ پڑھتا ہے تو اس کا صوتی اثر ہوتا ہے۔ پھر اس لفظ کے پیچھے جو شکلیں چھپی ہوتی ہیں وہ اس کے سامنے آجاتی ہیں اور پھر ان شکلوں کے پیچھے دبے مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے، اسی کی آمیزش سے ادب بنتا ہے۔

دبے ہوئے احساسات، جذبات اور اس کی پوری تاریخ اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ ساری چیزیں الگ الگ اثر انداز نہیں ہوتیں، بلکہ بہ یک وقت اثر کرتی ہیں اور یہی فن کار کی صناعی جانچنے کی میزان ہے۔

وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
(اقبالؔ)

صرف حرف ''ش'' کا استعمال خاموشی کی فضا قائم کر دیتا ہے۔ یا فیضؔ کی نظم ''بول'' کا ہر مصرع ہتھوڑے کی ضرب کاری ذہن پر لگاتا ہے۔ یا پھر یوسف ظفرؔ کی نظم ''رقص''۔ فن کار بھی اسی دنیا کا باشی ہے، جس میں ایک عامی سانس لیتا ہے، لہٰذا اس کے تجربات بہرحال اسی دنیا کے سماجی، معاشرتی اور ثقافتی اثرات کے طور پر اس کے ذہن میں محفوظ ہوتے جاتے ہیں جیسے پوسٹ آفس کے پوسٹ بکسوں میں خطوط۔ اسے جس وقت جس خانے کے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت اسے وہ تجربہ آتا جاتا ہے۔

بریلی، کانکے یا آگرہ کے پاگل خانوں میں رہنے والا بھی اپنے تجربات ہی دہراتا ہے، مگر اس میں اور ایک فن کار میں یہی فرق ہے کہ ایک پاگل کے تجربات گڈمڈ ہو کر اس کی زبان پر آتے ہیں اور ایک فن کار کے ذہن میں اسی وقت ایک خاص تجربہ استعارہ، تشبیہ یا خیال کی شکل میں آتا ہے، جس وقت سے اسے اس کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ دل اداس ہونے پر میرؔ کو مفلس کا چراغ یاد آنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

پھر فن کار اور مؤرخ میں بھی یہی فرق ہے۔ مؤرخ کا کام بس اتنا ہے کہ وہ واقعات و حوادثات عالم کو صحیح طور پر اس طرح پیش کر دے کہ کون واقعہ کب، کہاں اور کس طرح وقوع پذیر ہوا۔ فن کار ہمیشہ ذہنی اور تخیلی طور پر اسی دنیا کی سیر کرا دیتا ہے اور وہی نقشہ ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ یہ سب کچھ حال میں ممکن ہے جب فنکار کا مواد، اسلوب، تکنیک، ہیئت اور اس کا فن پارہ الگ الگ کوئی چیز نہ ہو، بلکہ ایک ہو۔ جسم اور کپڑے کی طرح نہیں جسد و روح کی مانند، تاکہ ہم جب کوئی فن پارہ پڑھیں، تو ہم پر وہی کیفیت ذہنی طاری ہو جائے جسے فن کار نے اس فن پارہ کی تخلیق کے دوران میں پالیا تھا اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ فنکار نے اپنے مواد سے چارکول تیار کیا ہے یا ہیرا۔

(اخذ و تلخیص از مجموعہ ''پرکھ'')

آیۃ الکرسی: تفسیر و تفہیم

آیۃ الکرسی: تفسیر و تفہیم غلام سرور کی آخری کتاب ہے۔انہوں نے اس کتاب میں متعدد ترجمے اور تفسیر کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ آیت سورہ البقرہ کی ۲۵۵ نمبر کی آیت ہے۔ حدیث میں اسے آیۃ الکرسی کا نام دیا گیا ہے۔ جون ۲۰۰۱ میں آیۃ الکرسی پر یہ کتاب مکمل کر کے ناظرین کے سپرد کر دی تھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہی تمام جہانوں اور زمین کا مالک ہے۔

یہ پوری زمین اور کائنات اسی کی ملکیت ہے اور اس کی کرسی آسمانوں سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔ کہیں کرسی کے معنی علم یا سلطنت بتائے گئے ہیں۔ اللہ رب العزت کو سمجھنے کے لئے تین وسیلے ہیں اور وہ ہیں مذہب، فلسفہ اور سائنس۔ اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے اور ہدایت کی ہے کہ وہ زمین، سمندر اور خلا کی تسخیر کرے۔

غلام سرور کو آیۃ الکرسی سے گہری عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کی جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، چینی، جاپانی، جرمن اور مختلف زبانوں میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ کاش کسی ملک کا سربراہ اس کی تشہیر کی ذمہ داری لے لیتا۔

اللہ کا تصور باقی تمام خداؤں سے جدا اور منفرد ہے۔ ایسا کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ غلام سرور لکھتے ہیں:

’’ آیۃ الکرسی کا اللہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ الحی اور القیوم کی بلاغت ہمیں بتاتی ہے کہ نہ وہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے۔ وہ ایک دن بھی آرام نہیں کرتا ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا باپ ہے۔ اس کے کسی کام میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ اور اس کی کرسی محیط ہے سماوات اور ارض پر۔

آیۃ الکرسی کی تفہیم بیان کرنے سے پہلے انہوں نے چند اہم باتوں کی طرف ہماری توجہ دلائی

ہے۔ مثلاً افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں لا الہ سے خدا کی نفی کی جاتی ہے۔ مگر دوسرے حصے میں الا اللہ کہہ کر ایک اللہ کے معبود اور رب ہونے کی حقیقت کی تصدیق کی جاتی ہے۔

اللہ نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ ہم نے ہر قوم اور ملک میں رسول، پیغمبر اور نبی بھیجا ہے۔ بلکہ اس کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر، ہادی، رسول، بشیر، نذیر اس دنیا میں بھیجے گئے۔ اور ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجا ہے تا کہ تم اللہ کی عبادت کرتے رہو اور شیطان سے بچتے رہو۔ (سورۂ النحل:۱۴)

اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا ہے کہ کوئی بھی محض پیدائش سے معزز اور بڑا نہیں ہوتا۔ بلکہ تم میں افضل وہی ہے جو متقی، نیک اور پرہیزگار رہو۔

بقول مولانا اشرف علی تھانوی اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس کی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور کوئی بھی اس کے برابر نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے (بقول مولانا محمد ادریس) کہ سورہ اخلاص کثرت سے پڑھا کرے۔

ایک بحث یہ بھی اٹھتی رہی ہے کہ خدا شخصی ہے یا غیر شخصی۔ ایک غیر شخصی خدا سے مذہب کی تسکین نہیں ہوتی۔ تقریباً سبھی مذاہب خدا کو شخصی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں پر محمد پکتھال کا ایک حوالہ پیش کیا گیا ہے:

The first thing to note that His Nature is so sublime, so fair, beyond our limited conceptions, that best in which we can realise Him is to feel that He is a personality, He is and not a mere abstract conception of philosophy. He is near us, He cares for us. We owe our existence to Him. Secondly He is the one and only God, nothing comparable to Him. He is eternal without begining or end. Fourthly we must not think of Him as having a son or a father. He is not like any other person. His qualities and nature are unique.

اب آگے ہم صرف دو مفسرین و مفکرین کی تشریح آیۃ الکرسی پیش کریں گے۔ اس لئے آیۃ الکرسی کی پوری آیت پڑھیں جو حسب ذیل ہے۔

اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ط لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

وَمَا فِي الْأَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ طيَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ط وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ط وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ طوَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ط وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ط قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ط فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ -(۲۵۵)

''اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔کون ہے جو اُس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر اس کی سفارش کر سکے۔جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے۔اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کے گرفت ادراک میں نہیں آسکتی الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود اُن کو دینا چاہے۔اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔اور اُس کی نگہبانی اُس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔'' (آیت۔۲۵۵،سورہ بقرہ) صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام زبردستی قبول کرایا جائے۔بلکہ ہر شخص کو اپنے عقیدے اور ضمیر کی آزادی ہے۔اس لئے کہ دین کی اصل غائت رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

کہا گیا ہے اگر تمہارا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔تو کیا پھر تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں۔لیکن جو سرکشی پر اتر جائے تو اس کا اطلاق شیطان پر ہے۔

یہاں پر ہم مولانا مفتی محمد شفیع کی تشریح مختصر طور پر پیش کرتے ہیں۔(معارف القرآن اول) اس آیت یعنی آیۃ الکرسی میں اللہ جل شانہٗ کی توحید ذات وصفات کا بیان ایک خاص انداز میں کیا گیا ہے۔اس آیت میں دس جملے ہیں۔

پہلے جملے اللّٰہُ لَا إِلٰهَ إِلَّا کے معنی ہے وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے۔

دوسرے جملے هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ط کے معنی عربی زبان میں وہ ''زندہ'' ہستی ہے جو ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والی ہے۔

تیسرے جملے لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ط کا مفہوم یہ ہے اللہ نینداور اونگھ سب سے بالا تر ہے۔

چوتھے جملے لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط کے معنی یہ ہیں کہ تمام چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور تصرف میں ہے۔

پانچویں جملے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ طیعنی ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی کی سفارش کر سکے بغیر اس کی اجازت کے۔

چھٹے جملے يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ط میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے تمام حالات وواقعات سے واقف اور باخبر ہے۔

ساتویں جملے وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ط کے مطابق انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے کسی علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے،مگر اللہ تعالیٰ ہی خود کسی کو جتنا علم عطا کرنا چاہے۔

آٹھویں جملے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ط کے مطابق اس کی کرسی اتنی بڑی ہے جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں۔

نویں جملے وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ط یعنی اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان اور زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ قادر مطلق کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

اور آخری دسویں جملہ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ یعنی وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے۔

سید قطب مصر کے مشہور مسلم فلسفی گزرے ہیں۔انہوں نے جو تشریح پیش کی ہے، وہ اختصار میں حسب ذیل ہے:

یہ آیت ایسی ہے جو ایمانی تصور کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہے۔یہ ایسی آیت ہے جو اللہ کی توحید کا عمیق ترین اور وسیع ترین مفہوم ہمارے سامنے لاتی ہے۔بلاشبہ ایک عظیم الشان آیت ہے جس کا مفہوم وسیع اور عمیق ہے۔یہ توحید کا واضح اور قطعی تصور ہے جس پر اسلامی فکر قائم ہے۔الحیُ القیوم......زندہ جاوید۔

تمام مخلوقات کی زندگیاں اللہ کی بخشی ہوئی ہیں۔صرف اللہ کی ذات ازلی اور ابدی ہے۔اس کی

کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ اسی معنی میں تنہا اللہ زندہ ہے۔

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ط

خدا کائنات کا نگراں اور منتظم ہے۔

القیوم کا مطلب ہے کہ خدا ہر موجود پر نگراں اور اس کا منتظم ہے یونانی فلسفی ارسطو کا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے مطابق اللہ اپنی مخلوقات میں کسی مخلوق کی فکر نہیں کرتا کیونکہ وہ اس سے بالاتر ہے۔ حالانکہ اس تصور کے نتیجے میں اللہ کا اس کائنات سے، جس کا وہ خالق ہے، تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ سید قطب اسلامی نقطہ نظر سے ارسطو کے نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط اللہ کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ:

اللہ ہر شئے کا منتظم اور نگراں ہے اور اسی سے ہر شئے کا قیام و بقا ہے۔ کائنات کی تمام کلی و جزوی اشیاء کی ہر وقت اور ہر حالت میں ایک ہوش ربا حقیقت ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط

مالک حقیقی صرف اللہ ہے:

ہر شئے پر اللہ کی مطلق ملکیت ہے۔ اس میں کسی کی شرکت نہیں۔ خدائے واحد ہی ازل سے ابد تک زندہ ہے۔ وہی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے کہ وہی ہر شئے کا مالک ہے۔ انسان جن چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے ان میں سے کس شئے کا بھی مالک نہیں۔ جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے وہ ایک محدود مدت تک کے لئے ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط

خدا کے یہاں کسی کی سفارش نہیں چلتی:

اس آیت سے الوہیت اور عبدیت دونوں کا مقام واضح ہوتا ہے۔ سبھی بندے خدا کے حضور عبودیت کے مقام پر کھڑے ہیں۔ کسی بندے کی جرأت نہیں کہ خدا کے سامنے سفارش کرے الا یہ کہ اسے اجازت بخشی جائے۔ اسلامی فکر میں اوہام اور خرافات کی کوئی گنجائش نہیں۔ رب رب ہے اور بندہ بندہ۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ط

خدا سب کچھ جانتا ہے:

خدا ان سب اشیاء کو جانتا ہے جو اس کے روبرو ہیں۔ خدا کے علم کا کوئی احاطہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کے مقابلے میں انسان کا علم نہایت محدود ہے۔ اللہ ہی انہیں کچھ علم بخشتا ہے جسے وہ چاہے۔ انسان خدا کے سامنے عریاں ہے۔ انسان ہر لحہ اپنے رب کے سامنے عریاں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان امور کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کی نظر کے سامنے ہے اور انہیں بھی کو ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ان جذبات و خیالات کو بھی جو دلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ط

انسان کا علم بہت کم اور خدا کا بخشا ہوا ہے:

لوگ اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اللہ کے اذن سے ہی اس کے علم میں سے کچھ حاصل ہوا ہے۔ لیکن اکثر اس فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خدا کا بخشا ہوا یہ علم خواہ کائنات کا کچھ علم قوانین یا اس کے علم غیب میں سے کسی شئے کا مشاہدہ ہوا جو کسی لحہ ایک معین مدت کے اندر انہیں حاصل ہو گیا ہو۔ یہ علم ہو یا وہ علم دونوں انسان کو فتنے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ اذن خداوندی جس کے باعث انہیں علم ملا ہے، بھول جاتے ہیں۔ اور اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے فخر و غرور اور کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔

خدا نے جس وقت انسان کو خلافت ارضی سونپنے کا فیصلہ کیا، اسی وقت اسے علم عطا کیا۔ اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ آفاق و انفس میں اسے اپنی نشانیاں دکھائے گا۔ اللہ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا۔

اس طرح دنیا میں علم کا ارتقا ہوتا رہا۔ لیکن اللہ نے کچھ علم کو انسان کے لئے مخفی رکھا۔ یہی حال اگلے لحہ کا ہے۔ اس میں کیا ہوگا؟ یہ ایک راز ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ یہی غیب کا معاملہ ہے۔ انسان سے بہت سے راز مخفی رکھے گئے ہیں جن کا خلافت ارضی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ط

وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ط

اللہ کا اقتدار:

اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ ان کی نگہبانی سے تھکتا نہیں۔

وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

اور وہی بلند وبرتر اور صاحب عظمت وجلال ہے:

جو کوئی یزداں بہ کمند اور ہوگا اسے آخرت کے عذاب میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہ دار آخرت ہے مخصوص لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنے لئے بلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔

ہم نے صرف دو مفسروں کی تشریحات پیش کر دی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ دیگر مفسروں کی وضاحت بھی غلام سرور مرحوم نے اکٹھا کر دی ہیں۔ ہم انہیں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

اب ہم ان تحریروں کی طرف توجہ کرتے ہیں جو غلام سرور مرحوم نے لکھی ہیں۔ انہوں نے مفسروں ومفکروں کی اس عظیم الشان آیت کی تفہیم وتشریح کر کے واضح معنی ومطالب ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں اور غایت احتیاط برتی ہے۔

غلام سرور مرحوم لکھتے ہیں کہ رام اور رحیم کے ماننے والے اس بات سے واقف ہیں کہ ہزاروں سال پہلے کیسے کیسے گاؤں، بستی کی بستی، چشم زدن میں صفحہ ہستی سے وجود سے عدم میں چلی گئی۔ آن کی آن میں پختہ کثیر منزلہ عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ جو لوگ پختہ مکانوں میں دبے پڑے تھے ان میں سے کئی دنوں بعد ایک بچہ زندہ سلامت نکالا گیا۔ ایک بیٹی اپنے باپ سے ملی۔ ایک عورت اپنے خاوند سے ملی۔ خدا نے ہمیں دکھلا دیا کہ موت اور حیات اسی کے ہاتھ میں ہے۔ فرعون کی فرعونیت ختم ہوگئی۔ قارون کا خزانہ کسی کام نہ آیا۔ نمرود کی خدائی نہیں چلی۔ ہم سب کا مالک وہی ہے جو سورج کو مشرق سے اگاتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ فرعون، قارون، نمرود اور شداد کا رب بھی وہی ہے جو ہم سب کا رب ہے۔

پھر آگے لکھتے ہیں، ہمارا رب خالق کائنات ہے۔ اللہ کے دشمن شیطان کے ساتھی ایک مکھی، ایک بچھو، ایک دیمک، ایک چیونٹی کی بھی تخلیق کر کے دکھا دیں۔ گرچہ یہ بڑے فخر سے کہہ رہے ہیں کہ ہم چاند اور مریخ پر پہنچنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ط

غلام سرور لکھتے ہیں، میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا کہ اس آیت میں کرسی سے کیا مراد ہے............آیۃ الکرسی کی اسی شان کا ذکر مقصود ہے کہ یہ آیت رب العزت کی خصوصیت بیان کرنے والی نہایت عظیم آیت ہے..................سائنس دانوں کو یہ بھرم نہیں ہونا چاہئے کہ وہی خدا ہیں نعوذ باللہ۔

الله لا اله

بس وہی ہمارا رب ہے جس نے ہمیں دل، دماغ، فکر عطا کی۔ ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

وہی اللہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔

غلام سرور ہمیں متوجہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں......ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ اللہ رب العزت نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ جب کسی مقام یا ملک یا قوم کی نافرمانی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اس قوم، اس ملک یا مقام کو اللہ تعالیٰ تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔ اس کے لئے زلزلہ، طوفان، بادوباراں، سیلاب، جوالامکھی، آتش فشاں کا استعمال ہوتا ہے۔

اب یہی دیکھئے گجرات کے ایک تباہ کن زلزلہ میں گاؤں کے گاؤں پوری طرح تباہ وبرباد ہو گئے۔ فلک بوس عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ گجرات کے زلزلہ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سرکاری ذرائع کے مطابق بیس ہزار بتائی گئی حالانکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کی موت ہوگئی۔ ہندوستان کے وزیر دفاع جارج فرنانڈیز نے مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی۔ انہیں خاموش کرنے کے باوجود بھی انہوں نے اپنے بیان کی تردید نہیں کی۔ اگر یہ تعداد ایک لاکھ بھی مان لی جائے تو یہ تعداد اب تک کے زلزلوں میں سب سے بڑی تعداد ہے۔ سشما سوراج وزیر مرکزی کی موجودگی میں تین روز تک یہ خبر نشر ہوتی رہی کہ ہمارے سیوکوں نے اکیلے ہی بوچاؤ بھج، انجار، کچھ احمد آباد، سابرمتی، سردار بلبھ بھائی پٹیل کی مورتی وغیرہ پچاسوں گاؤں میں ریلیف کا کام انجام دیا۔ حالانکہ کئی ملکوں کی مدد پہنچی تھی۔

آج قارون کا وارث امریکہ سے لے کر دنیا کے سب سے زیادہ مسلم آبادی والا ملک انڈونیشیا اور اس کا ایک جزیرہ سماترا زلزلہ اور دیگر تباہی سے متاثر ہے۔ غرض بندہ اپنی چال دکھاتا ہے اور قدرت، اگر ہم مان لیں۔ اب میں اس سے آگے کیا لکھوں، اپنی باتیں ختم کرتا ہوں۔ اگرچہ دل اور دماغ میں بہت ساری باتیں آ رہی ہیں، مگر بیان کرنے کا موقع نہیں۔ میں قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ غلام سرور مرحوم کی اس کتاب کا مطالعہ کریں، اور اپنی رائے سے اس فرد نامہ پر بھی آگاہ کریں اس ناچیز کو۔

غیرملکی سفر کی ایک مختصر روداد

غلام سرور نے ہندوستان سے باہر دنیا کے بہت سارے ملکوں کا سفر کیا۔

غلام سرور صاحب تین کتابوں کے لکھنے کا اردہ رکھتے تھے۔ ایک ''دنیا کا حال'' جس میں روداد سفر کی تفصیلی داستان ہو۔ دوسری ''قرآن کا اسلام'' یعنی قرآن کے مطابق اسلام کیا ہے؟ اور تیسری کتاب وہ اپنی ''خود نوشت سوانح'' لکھنا چاہتے تھے۔ مگر وہ تینوں کتابیں لکھنے میں ناکام رہے۔ اب ان کی مصروفیت کے علاوہ جو وجہ بھی ہو۔

قرآن پر لکھنے کا ارادہ تو انہوں نے اس لئے ترک کر دیا کہ وہ عربی زبان سے نابلد تھے۔ عربی زبان کے ماہر نہیں تھے۔ جہاں تک ان کی سوانح عمری کا معاملہ ہے، وہ ہمیں کچھ ٹکڑوں ٹکڑوں میں دستیاب ہے، لیکن بقول ان کے انہوں نے اپنی اس کتاب کا عنوان ''یادوں کا جنازہ'' لکھنا تو درکنار شروع بھی نہ کر پائے۔

انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کی روداد میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قاری کے لئے انتہائی مختصر اور تشنہ ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ واقفیت تو مل ہی جاتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم کہاں پر کھڑے ہیں۔ ہم نے کوئی سفر نہیں بھی کیا ہو پھر بھی حقیقت سے واقف ہیں کہ تہذیب کے عہد طفولیت سے ہماری دنیا کس حد تک ارتقا کی منزلوں اور سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے کہاں پہنچ گئی ہے کہ ''ہم یزداں پہ کمند'' کے غرور میں ڈوب گئے ہیں۔ بہر حال یہاں پر ہم ایک قادر مطلق، ایک خدا کی بات پر بحث نہیں کریں گے۔ غلام سرور کی آخری کتاب پر آگے کے صفحات کا ذکر کریں گے۔

غلام سرور کے سفر کی روداد کا ایک مختصر خاکہ ان کے ایک مرتب شدہ کتابچہ ''خطبات غلام سرور'' میں مل جاتا ہے۔ گرچہ یہ خطبات بھی نامکمل ہیں۔ ان کے خطبات کا اکٹھا کرنا ممکن نہیں۔

ہم یہاں پر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ انہوں نے غیر ملکی سفر میں ۱۹۶۵ء کے سفر حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۴ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ عمرہ کا شرف حاصل کیا۔

انہوں نے پڑوسی ملک نیپال کے علاوہ سعودی عرب، انگلینڈ، امریکہ، کناڈا، جرمنی، اسپین، اٹلی، ایران، یونان، مصر، روم، میانمار، بحرین، ہانگ کانگ، بینکاک، (تھائی لینڈ) کینیا، زمبابوے، وغیرہ دیکھا ہے۔ افریقہ، ایشیا، یورپ کا سفر کیا ہے۔ ان ملکوں کا سفر بھی ان کے ذہن مین ایک مقصد کے ساتھ تھا، محض تفریح کے لئے نہیں۔ اتفاق سے پاکستان کی زمین پر پاؤں رکھنے کا موقع نہیں ملا۔ کبھی ہوائی جہاز اس ملک سے گزرے تو ملک میں کرفیو۔ پاکستان کی زمین پر پاؤں رکھنے کے لئے اللہ سے ہی اجازت نہیں تھی۔

غلام سرور کے یہ الفاظ بھی خاص طور سے ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی تک جتنے ملکوں کا انہوں نے سفر کیا اور نام گنوایا، ان میں ان کو سب سے زیادہ (اس سنی مسلمان کو) ایران پسند آیا۔ بچپن کی عصبیت ان کے دماغ میں نہیں تھی

امام خمینی نے ۱۵ سال کی جدوجہد کے بعد رضا شاہ پہلوی کے چنگل سے ایران کو آزاد کرایا۔ چین اور ایران ہی دو ملک ایسے ہیں جو امریکہ کے سامنے نہیں جھکے۔ ویت نام کا ایک چھوٹا ملک بھی امریکہ سے ۱۷ سالوں تک لڑتا رہا۔

سعودی عرب، پاکستان اور ایرن یہ تینوں ممالک ایسے ہیں جو اسلامی حکومت کے قیام کے دعوے دار ہیں۔ غلام سرور کا مشاہدہ ہے کہ اسلام شاید زندہ رہ جائے تو ایران کی زمین ہی ہو سکتی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں کسی، کسی کونے میں، کسی حکومت میں اسلام زندہ نہیں ہے۔ وہ یہ بات پوری اتھارٹی کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ دراصل اسلام کی ''حکومت الٰہیہ'' کا ماڈل دنیا کے کسی ملک میں نہیں۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ سعودی عرب اور ایران میں چوری اور ڈاکہ، زنا کاری کے واقعات نہیں ہوتے ہیں۔ سرور صاحب یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا میں اسلام کا مستقبل کیا ہے ؟ کوئی عملی نمونہ دکھایئے۔ وہ کہتے رہے ہیں کہ عمان میں، مسقط میں، بحرین میں، قطر میں یہ چھوٹے چھوٹے ملک ہیں۔ یہاں اسلامی معاشرہ نظر آتا ہے۔ وہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ جس نے اسپین کی آٹھ سو سال کی حکومت کا مطالعہ کیا ہے، گرچہ خاصی شاندار رہی ہے، اس کا نام ونشان کیسے مٹ جاتا ہے۔

جس نے اسپین کی تاریخ پڑھی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ اسپین میں مسلم حکومت اس وقت دنیا کی کتنی شاندار حکومت تھی۔ اور مغربی ممالک اس سے کتنا پیچھے تھے۔ انگلینڈ کی سڑکیں بھی کیچڑ آلود تھیں۔ اسپین سائنس وفلسفہ اور دوسرے علوم کا دنیا میں مرکز ومحور اور کشش کا باعث تھا۔ جب پچھلے سال چین گئے۔ بیجنگ

پہنچے............اور جس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے، یہ اتنا بڑا ہوٹل تھا کہ اس کے متعلق دعویٰ کیا گیا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔اس کے اندر سب کچھ موجود ہے۔ڈائننگ ہال بھی ہے اور ایک کانفرنس ہال بھی ہے۔باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں۔

پورے اسپین میں آج ایک بھی مسلمان نہیں۔غلام سرور نے اپنے یہاں کی ایمبیسی سے کہلوا دیا تھا کہ وہ قرطبہ اور غرناطہ بھی جائیں گے۔چین میں بیجنگ میں جو سب سے بڑی مسجد ہے وہاں بھی سرور صاحب اپنی بیگم کے ساتھ کھڑے ہیں۔ادھر سے اگر کوئی چینی مسلمان گزر بھی رہا ہے تو لباس سے بھی کوئی مسلمان نظر نہیں آتا۔ ایمبیسی کی سہولت مل جانے کی وجہ سے ٹرین میں ریزرویشن سے قرطبہ پہنچ گئے۔قرطبہ کی مسجد میں اندر جانے کی اجازت بھی مل گئی، جو اب کیتھرال میں بدل گئی ہے۔میوزیم بھی دیکھا۔کہنے کو مسجد قرطبہ کی زیارت ہوئی۔میاں بیوی نے دو رکعت نماز بھی ادا کر لی۔بقول غلام سرور ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، جنہوں نے اقبال پر پی .ایچ .ڈی .کی ہے، انہوں نے کہا تھا کہ وہ بھی اسپین گئے تھے۔علامہ اقبال نے (اسپین) مسجدِ قرطبہ پر بڑی شاندار نظم لکھی ہے جو ان کی شاعری میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔مسجد قرطبہ تو اس طرح پہچان میں آئی کہ ان کا ایک مصرعہ یاد آ گیا۔''تیرے ستون بے شمار'' اس سے اندازہ ہوا کہ یہی مسجد ہے جس کے بیشمار ستون نظر آتے ہیں۔پھر اسی شام اسی بولیٹ ٹرین سے غرناطہ کی شاندار عمارتیں اور مستحکم قلعہ دیکھا۔

غلام سرور کو یقینی طور سے یہ بات بھی یاد آئی ہوگی کہ ۳۰ سالوں کی خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد حضرت معاویہؓ پوری طرح اقتدار میں آ گئے۔انہوں نے اسلام کا راستہ ہی بدل دیا۔اور یہیں سے ملوکیت کا دور شروع ہوا۔مسلمانوں نے پوری دنیا میں جہاں ان کا اقتدار رہا حضرت معاویہ کی تقلید کی۔عمرؓ کی تقلید کسی نے نہیں کی۔غلام سرور ایران کی حمایت کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
ممکن ہے کہ انسان کی تقدیر بدل جائے

غلام سرور ایران گئے تو وہاں کی مجلس (پارلیامنٹ) کے اسپیکر اور صدر ہاشمی رفسنجانی سے بھی ملنا چاہتے تھے۔لیکن وہ لوگ انڈونیشیا اور ملیشیا گئے ہوئے تھے۔وزیر خارجہ ان کے ساتھ تھے۔اس لئے مجلس کے ڈپٹی چیرمین سے ملاقات ہوئی اور رات کا کھانا ڈپٹی فارن منسٹر کے یہاں ہوا۔کھانے کی دعوت میں سرور صاحب کی بیگم نے بھی یہی کہا کہ اب تک اپنے شریک حیات کے ساتھ وہ دورے میں جہاں بھی گئیں

آپ کا ملک سب سے اچھا لگا۔

غلام سرور جرمنی پہنچے تو وہاں بھی ڈاکٹر ہیم چندر جھا بون میں ہی مقیم تھے اور دربھنگہ کی کیوٹی سیٹ کے ہی رہنے والے تھے۔ان سے پہلے سے بھی خط و کتابت ہو رہی تھی۔آپ نے جتنا کام کیوٹی میں کیا ہے اتنا پہلے کسی نے نہیں کیا۔انہوں نے ایک پروگرام چھپوا دیا کہ لیڈر غلام سرور اسپیکر ان دی بہار اسمبلی پٹنہ اینڈ مسز سرور بون جرمنی دیکھنے آ گئے ہیں۔ڈاکٹر جھا نے ان کی بڑی ضیافت کی۔چھ سال لگا تار جنگ کے بعد جرمنی کی قوم دس برس کے بعد کھڑی ہوئی۔وائس آف جرمنی میں لنچ ہوا اور انٹرویو بھی۔وائس آف جرمنی کی پینتیس منزلہ عمارت ہے اور چالیس زبانوں میں پروگرام نشر ہوتا ہے۔

غلام سرور نے روم کا سفر بھی کیا جو عیسائیوں کا مرکز ہے۔اس کا مختار کل پوپ ہے۔عیسائی دنیا اس وقت تمام برائیوں اور غلاظت میں ڈوبی ہوئی ہے پہلے ان کا نشانہ سوویٹ یونین تھا۔آج ان کا نشانہ ہے اسلام اور مسلم دنیا۔

ہر جگہ سفر کی سہولت رہی۔دلی سے لندن اور کناڈا گئے۔جناب غلام سرور نے یہ بھی کہا کہ اس غلط فہمی کو دور کر لیجئے کہ مسلمان ساری دنیا میں موجود ہیں۔(اور اسلام برطانیہ اور امریکہ میں پھیل رہا ہے) جب وہ لندن پہنچے تو ان کے ایک دوست سید محمد اسرار الحق نے ہوائی اڈہ پر ہی ایک اشتہار تھما دیا۔جلسہ عام میں اسپیکر بہار اسمبلی ۴/اکتوبر ۱۹۹۴ء میں ۷/بجے شام انڈین مسلم فیڈریشن ہال میں خطاب کریں گے۔آزادی کے بعد جو لوگ موت کے ڈر سے یا روپے کی لالچ میں دوسرے ملکوں میں فرار ہوئے تھے وہ اپنے متوقع بھرم کی جنت میں بھلے ہی فیزیکل موت نہ مریں لیکن کلچرل موت مریں گے۔

۱۹۷۸ء میں غلام سرور اس وقت کرپوری ٹھاکر کی وزارت میں تھے۔اس وقت ہندوستان کے مرکزی وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپئی تھے۔انہوں نے اپنے ہائی کمشنر کو وائرلیس دے دیا تھا کہ غلام سرور جا رہے ہیں۔ساری سہولتیں جو مہیا ہو سکتی ہیں ان کو دی جائیں۔

ہم نے غلام سرور کے غیر ملکوں کے سفرناموں کو اور بھی مختصر کر کے پیش کیا ہے۔ممکن ہے قارئین کو کچھ باتیں تلخ لگی ہوں گی، مگر جو حقیقت ہے وہ میں نے بیان کر دیا۔

❋

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا......

۲۴۵صفحات کی یہ کتاب ان سپاس ناموں کا مجموعہ ہے جو غلام سرور مرحوم کو ان کے وزیر تعلیم (ثانوی) اور اسپیکر حکومت بہار (بہار قانون ساز اسمبلی) بننے پر پورے بہار کی ادبی انجمنوں، اداروں، مدارس، اقلیتی اسکولوں اور کالجوں، سیاسی اور سماجی کارکنوں، معروف وممتاز شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے ان کے والہانہ استقبال میں پیش کئے۔

اس میں کم ۹۱ (اکانوے) ایسے سپاس نامے موجود ہیں۔ پہلی بار اتنے سپاس ناموں کا ایک ایسا مجموعہ دیکھ کر ہم تو حیران رہ گئے۔ اردو میں اب تک یہ صنف نہیں ہے۔ مگر اسے دیکھ کر ہمیں اردو کے قدیم شعرا کے کچھ ایسے شعری قصیدے یاد آجاتے ہیں جو انہوں نے بادشاہوں، حکمرانوں اور عظیم شخصیتوں کی تعریف میں لکھے ہیں۔

یہاں ہم اردو کی قصیدہ گوئی کی تاریخ میں جانا نہیں چاہتے جو شاہان مملکت اور ارباب اقتدار کے علاوہ بارگاہ رسالت مآب، خلفائے راشدین اور بزرگان دین کی شان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ غالب، مومن اور ذوق جیسے اردو کے شعرا نے شوخی وجدت طرازی کے ساتھ کچھ شاندار قصیدے پیش کئے ہیں۔ سپاس ناموں میں تعریف وتوصیف کے کلمات کسی اہم شخصیت کے استقبال میں عوامی محفلوں اور جلسوں میں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور شکرگزاری کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پیش نظر سپاس نامے بھی سالار اردو، اپنی صحافتی زندگی کی بیباک تحریروں اور حق گوئی اور انصاف کی آواز اٹھانے نیز اپنی تقریر کی پر زور خطابت کرنے والے غلام سرور مرحوم کی جرأت مندانہ قیادت کو سلام عقیدت اور ہمنوائی کا ایک حسین امتزاج ہے۔ عزم، حوصلہ، امیدیں اور تحریک عمل کی راہ استوار کرتا ہے۔

غلام سرور کو پیش کردہ سپاس نامے ہر پیکر تصویر، نقش فریادی ہے جو کاغذی لباس میں فروغ علم کو وا کرنا چاہتا ہے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے سپاس ناموں کے علاوہ ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء کے سپاس نامے بھی تاریخ، ادب، مرثیہ، انداز بیان کی ندرت، اظہار بیان میں فصاحت وبلاغت کے پرکشش عناصر بھی

ملاحظہ کریں:

''شاہ نواز احمد خاں بھی قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے تمام حتی الامکان سپاس ناموں کو یکجا کر کے ایک کتاب کی صورت اشاعت کی منزل تک پہنچایا۔ ورنہ شاید بلکہ یقیناً ہم ان نقش فریادی کی شوخیوں سے محروم ہو جاتے۔

''بعالی خدمت! سرورقوم، رہبر ملت، نازش بہار، عزت مآب الحاج غلام سرور............جرأت و بیباکی، حق پسندی وحق گوئی کی صفات (کے ترجمان).................بھائی محترم! حیرت میں ہوں کہ آپ کو کس نام سے مخاطب کروں ؟ صحافی یا انشاپرداز یا خطیب بے مثال، افکار اقبال کا شناور خادم ملت یا الحاج غلام سرور ؟..................''

بہت سارے سپاس ناموں میں، میں یہاں صرف ایک سپاس نامہ پیش کر رہا ہوں:

''آپ سنت یوسفی کے کئی مراحل طے کر چکے ہیں۔ اب للہ جل شانہٗ آپ کو عزیز مصر ہونے کا شرف بخشا ہے۔ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے خزینہ علوم پر آپ کو معمور کیا ہے اور بحمد اللہ آپ کے اعجاز نذیر اور ضرب کلیمی سے محکمہ تعلیم کی پرخوار وادیوں میں نئے چشمے پھوٹ نکلے............عظیم تاریخ کے صفحات پر زریں حروف سے لکھا جائے گا کہ ثانوی درجوں تک کی تعلیم پوری ریاست میں مفت کر دی گئی۔''

(اساتذہ مدرسہ شمس الہدیٰ، ۷؍مئی ۱۹۷۸ء)

اتنے سارے سپاس ناموں کو پڑھ کر یہی اندازہ ہوا کہ کتنی مقبولیت اور ہر دل عزیزی تھی غلام سرور کی۔ اس قدر والہانہ استقبالیہ تو شاید ہی کسی کو ملا ہو۔

ایک اور بات بھی یاد آتی ہے کہ انہوں نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ ہم نے یہ آرڈر جاری کر دیا ہے کہ ہر مدرسہ میں لازمی طور پر ایک حافظ قرآن کی تقرری ہوگی۔ اور محکمے سے اعتراض اور بحث کے بعد ان کے سرٹیفکیٹ کے مساوی فوقانیہ، عالم، فاضل) میٹرک، آئی۔اے۔ کی تنخواہ بھی مقرر کرنے کی ہدایت دے دی ہے۔ اور شاید یہ میری نجات کا ذریعہ بھی بن جائے۔ واقعی ان بیچارے مدرسہ کی تعلیم حاصل کرنے والوں پر ان کی صورت حال پر افسوس بھی آتا ہے۔ مدرسوں میں اصلاح کی ضرورت بھی ہے۔ اور اس کے متعلم آگے کی تعلیم کالج میں بھی حاصل کریں تاکہ ایک بہتر مستقبل کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

❋

تصانیف غلام سرور

(۱) پرکھ (چھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۵۱ء

(۲) مقالات (پرکھ کے مضامین کے علاوہ دیگر دس مضامین ۲۰۰۰ء

(۳) پہلا وہ گھر خدا کا

(۴) عوام کی عدالت میں

(۵) گوشے میں قفس کے

(۶) حرف اول......حرف آخر

(۷) جہاں بینی

(۸) خطبات سرور

(۹) دی لاسٹ ورڈ

(۱۰) صدا دے چلے

(۱۱) مدارس اسلامیہ: اقلیتی اسکول وکالج

(۱۲) ان بن جینا کہ جان دینا To be or not to be

(۱۳) جہاں ہم ہیں

(۱۴) چراغ مصطفوی

(۱۵) آیت الکرسی: تفسیر و تفہیم جون ۲۰۰۱

(۱۶) غلام سرور کے استقبال میں ۹۱ سپاس ناموں کا ایک مجموعہ بنام اگست ۱۹۹۸ء
"کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا"
غلام سرور مرکز تحقیق: خواجہ پورہ، بیلی روڈ، پٹنہ

❀

کتابیات

غلام سرور کی سبھی تصنیفات

نوجوان ہفتہ وار...... "ہم کیا کریں" نمبر جنوری ۱۹۴۸

غلام سرور کی آخری خصوصی تصنیف - آیۃ الکرسی: تفسیر و تفہیم جون ۲۰۰۱
(غلام سرور مرکز تحقیق پٹنہ)

باغی دانشور (غلام سرور پر ایک کتاب - مصنف سعدین طیبی) ۱۹۹۸

رسائل

غلام سرور کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر - یوم اردو

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو......مجلّہ جنوری ۱۹۹۵

غلام سرور کی ۷۱ ویں سالگرہ کے موقع پر - یوم اردو - مجلّہ

صابر آروی جنوری ۹۶/۹۲

گوشہ غلام سرور......زبان و ادب جنوری ۲۰۱۲

مدیر ڈاکٹر منصور احمد اعجازی

مریخ (ماہنامہ)......مدیر عبد المغنی جنوری ۲۰۰۰

اردو دوستوں سے دو دو باتیں - ڈاکٹر احسان اشرف ۱۹۷۳
(بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کارگزاریاں / ایکٹنگ جنرل سکریٹری انجمن)

فروغ اردو، لکھنؤ (ماہنامہ) اردو مہم نمبر - مرتب اقبال صدیقی جنوری/فروری ۱۹۶۸

صنم (ماہانہ) پٹنہ بہار نمبر مدیر ڈاکٹر وہاب اشرفی - جنوری تا اپریل ۱۹۵۹

رسالہ 'ندیم'، گیا، بہار نمبر ۱۹۲۵ء

رسالہ 'ساغر نو'، پٹنہ (اختر اورینوی نمبر)

❀

خراج عقیدت

جاں بازِ اردو غلام سرور مرحوم کے نام

اے غلام و عاشقِ محبوبِ اردو السلام
ملک بھر میں سب نے دیکھا تیرا جادو السلام
زندگی بھر خدمتِ انسانیت کرتا رہا
کب بھلا پائے گی دنیا یہ تری دل کش ادا
شاد ہو، ناشاد ہو، برباد ہو، آباد ہو
آئے ہیں کس کام سے یہ بات سب کو یاد ہو
نوجوانوں کے لئے ہے رہ نما اب تیری ذات
تیرے جیسے لوگ زندہ رہتے ہیں بعد الممات
سروری کرتا رہا اور نام تھا تیرا غلام
فرض ہے یہ اہل اردو کا کریں تجھ کو سلام
صارمؔ جاں سوز کے لب پر یہی ہے اب دعا
تیرے کاموں سے رہے خوش مطمئن راضی خدا

ابونصر فاروق صارمؔ عظیم آبادی

ختم شد